

.... اور ایک بُت شکن پیدا ہوا

(حصہ سوم، حصہ چہارم)

(سلطان محمود غزنوی کے جہاد اور جاسوسوں کی جذباتی اور واقعاتی داستان)



عنایت اللہ

فہرست

۶	رتن کماری، رضیہ اور راجیا پال
۳۶	یہ معجزہ تھا
۸۶	قلعے جونہروں نے سرکے
۱۱۳	سومناٹ کے دروازے پر
۱۵۶	یہ ستارہ بھی ٹوٹ گیا

دکن کاری، رضیہ اور راجیا پال

قنوج برغزنی کی فوج کا قبضہ تھا اور وہاں سالار ابوالقدر سلجوقی قلعہ دار تھا۔ مہاراجہ راجیا پال جو محاصرے سے پہلے ہی فرار ہو گیا تھا، ابھیس بدل کر قنوج کے قلعے میں گیا تھا اور ابوالقدر سلجوقی سے درخواست کی تھی کہ وہ شکست تسلیم کر چکا ہے اور اس کے عوض اُسے ایک مقام میں جس کا نام باری تھا، راجدھانی قائم کرنے کی اجازت دے دی جائے۔ ابوالقدر سلجوقی نے اُسے اجازت دے دی تھی لیکن یہ بھی کہا تھا کہ معاہدے کی شرائط سلطان محمود نے طے کریں گے۔ اُسی روز ایک قاصد کو غزنی روانہ کر دیا گیا تھا۔

سلطان محمود نے شرائط مقرر کر دی تھیں جو راجیا پال نے قبول کر لی تھیں۔ ان میں اہم یہ تھیں کہ راجیا پال کسی حالت میں غزنی کی فوج کے خلاف نہیں اُڑے گا۔ اس کی نئی راجدھانی میں اپنی فوج کے کچھ کماندار اور ان کا عہدہ رہے گا جو نئی ریاست کی فوج اور دیگر شعبوں پر نظر رکھے گا۔ راجیا پال پر کسی نے حملہ کیا تو غزنی کی فوج اس کی مدد کو پہنچے گی۔ سلطان محمود نے اُس کی فوج کی حد مقرر کر دی تھی اور اس کی ریاست باری کا دفاع اپنے دے لے لیا تھا۔

چونکہ مہاراجہ راجیا پال نے خود کو دیا تھا کہ اُس نے تمام تر خزانہ قنوج سے نکال کر کہیں چھپا لیا تھا، اس لیے سلطان محمود نے اُس سے تاوان وصول

کرنے کا بھی حکم دیا۔ اس کے علاوہ اُسے باغیزار بھی بنا لیا گیا۔ سلطان محمود نے غزنی سے ابوالقدر سلجوقی کو یہ حکم بھی دیا کہ راجیا پال پر نظر رکھی جائے اور اس کے متعلق اطلاعات غزنی بھی جاتی رہیں۔ ان احکام سے پتہ چلتا ہے کہ سلطان محمود کو مہاراجہ قنوج کے ساتھ گھمیری دیکھی تھی جس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ مہاراجہ قنوج کو مغلوں کیے رکھنا چاہتا تھا۔

مہاراجہ راجیا پال نے غزنی کے ساتھ تو دوستی کر لی مگر سارا ہندوستان اُس کا دشمن ہو گیا۔ تین بڑے ہی طاقتور مہاراجے اُس کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ ان میں ایک کالنجرا کا مہاراجہ گندھ تھا جسے بعض مورخوں نے نندہ رائے بھی لکھا ہے۔ دوسرا گوالیار کا راجہ ارجن تھا اور تیسرا لاہور کا مہاراجہ ترلوچن پال تھا جو سلطان محمود کے سامنے نہیں آتا تھا کیونکہ وہ سلطان کا باغیزار تھا لیکن اس نے اپنی فوج قنوج سے کچھ دور گھنے جنگلوں میں رکھی ہوئی تھی۔ بعض مورخوں نے لکھا ہے کہ وہ ترلوچن پال نہیں بلکہ اُس کا بڑا بھائی بھیم پال تھا لیکن زیادہ تر نے اسے ترلوچن پال ہی کہا ہے۔ وہ دوسرے مہاراجوں کے لیے ایک دھوکہ بنا ہوا تھا۔ انہیں کہتا تھا کہ وہ ضرورت کے وقت اپنی فوج سامنے لانے لگا۔

یہ تینوں مہاراجے اس کوشش میں تھے کہ راجیا پال سلطان محمود کی اطاعت ترک کر دے اور ان کے ساتھ مل جائے مگر راجیا پال ان سب سے قطع تعلق کیے رکھنا چاہتا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ غزنی کے فوجی حاکم اُس کے ساتھ تھے جو اُس پر نظر رکھتے تھے۔

*

ان میں ایک کماندار ذوالقرنین تھا جسے ہندوستان کی جنگوں کا تجربہ سب سے زیادہ تھا اور وہ بھڑے اور ملتان میں بہت عرصہ رہا تھا۔ اس عرصے میں اُس نے اُس وقت کی ہندوستانی زبان سیکھ لی تھی اور وہ ہندوؤں کو بڑی اچھی

طرح سمجھتا تھا۔ اسی لیے اُسے باری میں مہاراجہ راجیپال کا شیرنیا گیا تھا۔ وہ دوازدہ اور خوب جوان تھا۔ ہنس، مسکھ اور طنسار۔ وہ ہندوؤں میں بھی ہر دلعزیز تھا۔

ذوالقرنین نے ایک ہندو لڑکی رتن کھاری کے ساتھ شادی کر لی تھی جو رتن کھاری نہیں رہتی تھی بلکہ رنیدین گئی تھی۔ یہ لڑکی اُسے مستھار میں ملی تھی لیکن یہ ملاقات بڑے ہی خوفناک حالات میں ہوئی تھی۔ نضامیں خون کی بوچی ہوئی تھی اور ارد گرد لاشیں محل سڑ رہی تھیں۔ غزنی کی فوج نے جب مستھار پر حملہ کیا تھا تو شہر سے باہر ایک خوزیر مومک ہوا تھا۔ ایک دور روز پہلے طوفانِ بادِ باران نے تباہی پائی تھی۔ ہندوستان کے کونے کونے سے ہندو مستھار کی پوجا کے لیے آئے تھے۔ بعض لوگ ایسے بل بیلوں کو بھی ساتھ لائے تھے۔

مستھار کی فوج نے جلدی بھیار ڈال دیئے تھے۔ شام کا وقت تھا۔ ذوالقرنین اپنے دو سواروں کے ساتھ مستھار کے ارد گرد گشت کر رہا تھا۔ ماحول بھیانک تھا۔ طوفان سے درختوں کے ٹہن ٹوٹ کے گرے ہوئے تھے۔ باہر سے آئے ہوئے ہندوؤں کے خیمے اکھڑے پڑے تھے اور لاشیں بھی تھیں۔ لڑائی میں زائرین کی کچھ تعداد ماری بھی گئی تھی۔

ذوالقرنین کو شام کے گہرے دھندلے میں کسی کے بھاگتے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اُس نے اُس کے پیچھے گھوڑا ڈال دیا۔ بھاگتے قدم رک گئے اور اُسے رونے اور بکسنے کی آوازیں سنائی دیں۔ ذوالقرنین نے گھوڑے سے اتر کر دیکھا۔ اُسے ایک درخت کے گہرے ہونے ٹہن کی شاخوں میں ایک عورت یا بچی بیٹھی ہوئی نظر آئی۔ ذوالقرنین نے شاخوں میں سے ہاتھ بڑھا کر اُسے اٹھایا تو وہ اور زیادہ رونے لگی۔ اس کے رونے میں دہشت ننگ نایاں تھیں۔ اس کا ہر پرکشش اور لبا تھا۔ قریب ہو کے دیکھا۔ وہ جوان لڑکی

تھی۔ ”مجھے قتل کر دو“۔ وہ کانپتی ہوئی آواز میں فریادیں کرنے لگی۔ ”مجھے ہاتھ نہ لگاؤ۔ مجھے جان سے مار دو۔ اپنے ساتھ نہ لے جاؤ۔“ ”ہم یہاں عورتوں کو قتل کرنے نہیں آئے لڑکی!“۔ ذوالقرنین نے کہا۔ ”ہم عورتوں کی جان اور عزت کے محافظ ہیں۔ تم کہاں جانا چاہتی ہو۔ ہم تمہیں وہاں پہنچا دیں گے۔“ ”میں مرنا چاہتی ہوں۔“ لڑکی نے روتے ہوئے کہا۔ ”مجھے میرے ماں باپ کے پاس پہنچا دو۔“ ”کیا وہ مر گئے ہیں؟“

”ہاں۔ وہ مر گئے ہیں۔“ لڑکی نے کہا۔ ”میں جہاں سے اُٹھ کر دوئی تھی وہاں ان کی لاشیں پڑی ہیں۔ میرا ایک جوان بھائی بھی مارا گیا ہے۔“ یہ لڑکی اپنے والدین اور بھائی کے ساتھ بڑی دُور سے آئی تھی۔ پہلے طوفانِ بادِ باران نے انہیں تباہ کیا، پھر وہ دونوں فوجوں کی لڑائی میں کھلے گئے۔ لڑکی کہیں چھپ گئی تھی اس لیے نہ مل گئی۔ اب اپنے آپ کو غزنی کے فوجیوں کے قبضے میں دیکھ کر اُس کی رہی سہی جان بھی نکل گئی۔ ذوالقرنین اُسے اس حالت میں اکیلے نہیں چھوڑنا چاہتا تھا مگر لڑکی اُس کے قدموں میں گر پڑی اور فریادیں کرنے لگی۔ ”میں کھواری ہوں۔ کسی غیر مرد کے ساتھ جانے سے پہلے مر جانا چاہتی ہوں۔“

ذوالقرنین کو اسے اپنے ساتھ لے جانے میں بڑی سخت مشکل پیش آئی۔ وہ چلتی نہیں تھی۔ اُسے گھسنا بھی پڑا اور اٹھانا بھی پڑا۔ ذوالقرنین اسے بار بار کہتا تھا کہ ہمارے لیے یہ گناہ ہے کہ ایک جوان اور بے آسرا لڑکی کو اس خوفناک ماحول میں اکیلا چھوڑ جائیں۔ وہ لڑکی کو ساتھ لے کر اپنے اعلیٰ کماندار کے پاس چلا گیا۔ وہ وقت لڑکیوں اور بچوں کو سنبھالنے کا نہیں تھا۔ اُسے کہا گیا کہ اسے اپنے ساتھ رکھنا چاہیے ہو تو رکھ لو۔ کسی ہندو کے حوالے کرنا چاہو تو کر دو لیکن یہ دیکھ لینا کہ تمہارے فرشتوں کے

راستے میں نہ آئے۔

یہ ہندو لڑکی ذوالقرنین کے فرائض کے راستے میں تو نہ آئی، اس کی زندگی میں ہمیشہ کے لیے آگئی۔ وہ چونکہ کماندار تھا اس لیے اُس کا خیر و گمگشت تھا۔ لڑکی تمام رات اُس کے خیمے میں رہی۔ کانپتی رہی۔ روتی رہی۔ ذوالقرنین کی محنت سماجت کرتی رہی اور اُس کی آنکھ لگ گئی۔ اس کی آنکھ کھل تو اُس نے ذوالقرنین میں کوئی تبدیلی نہ دیکھی، نہ اُس میں کوئی تبدیلی آئی۔ اس کی رات ویسے ہی گزر گئی جیسے وہ باپ ادب بھلی کے قریب سویا کرتی تھی۔

”کیا میں تمہیں اچھی نہیں لگی؟“ لڑکی نے ذوالقرنین سے پوچھا۔
”اگر تم مجھے اچھی نہ لگتیں تو ہمارا وہ خطہ پورا ہو جاتا جس کے در سے تم میرے ساتھ نہیں آ رہی تھیں۔“ ذوالقرنین نے کہا۔ ”تم نے کہا تھا کہ تم کنواری ہو۔ میں کہہ رہا ہوں کہ تم بہت خوبصورت ہو۔ میں تمہیں پاک لڑکی سمجھتا ہوں اور پاک رکھوں گا۔ اب کہو کہاں جانا چاہتی ہو۔ دل سے سب خوف تار دو۔“

لڑکی اُسے کچھ دیر دیکھتی رہی، پھر اُس کے پاؤں پر لیے۔ ذوالقرنین نے اپنے پاؤں پیچھے کر لیے اور کہا۔ ”ہمارے مذہب میں کسی انسان کو اجازت نہیں کہ کسی کو اپنے آگے سجدہ کرنے پر مجبور کرے۔ مجھے گناہ کا نہ کرو.... کہو کہاں جانا ہے؟“

لڑکی نے آہ بھری اور بولی۔ ”لڑکی کو ماں باپ کا گھر چھوڑ کر کہاں نہ کہیں تو جانا ہی ہوتا ہے۔ میرے ماں باپ مجھے چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ اب تم بتاؤ کہ کہاں جاؤں؟“

”اگر میرے ساتھ رہنا چاہتی ہو تو ہمیں اپنا مذہب چھوڑنا پڑے گا۔“
— ذوالقرنین نے کہا۔ ”تم تھوڑے سی دنوں بعد محسوس کرو گی کہ تم نے اچھا کیا ہے کہ اپنا مذہب چھوڑ دیا ہے۔“

لڑکی خاموش ہو گئی پھر گہری سوتج میں کھو گئی۔ ذوالقرنین اسے بتانا نہیں چاہتا تھا کہ وہ اُس کے دل میں اُتر گئی ہے۔ وہ بہت سی خوبصورت لڑکی تھی۔ اُس نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ اس لڑکی کو وہ اپنی بیوی بننے والے درجہ پر اُس کے فرائض کے راستے میں حائل ہو جائے گی۔ غزنی کا یہ کماندار کچھ دیر کے لیے تو اپنے فرائض کو بھول گیا تھا۔

”میں تم پر کوئی شرط عائد نہیں کر رہا۔“ ذوالقرنین نے کہا۔ ”اور میں تمہیں مجبور سمجھ کر تم پر اپنا فیصلہ نہیں ٹھونس رہا۔ اگر جانا چاہو تو بتا دو۔“
”مجھے ہری کرشن کے قدموں میں بٹھا دو۔“ لڑکی نے کہا۔ ”میں ساری عمر مندر میں گزار دوں گی۔“

ذوالقرنین کا خون اُبل پڑا۔ اُس کی آواز میں غصے کی جھلک آگئی۔
— ”اپنے آپ کو دھوکے نہ دو لڑکی! پتھر کے ہری کرشن کے سامنے میں تم بند کتوں کی دانتہ بنی رہو گی اور ہندو ساری ساری عمر اسی طرح گزرے گی۔ تم کس ہو۔ نادان ہو۔ اسی لیے مجھے تم سے ہمدردی ہے، وہ نہ تم کیا ہو۔ ایک لڑکی ہو۔ ایک لڑکی سا ہندوستان نہیں ہو سکتی۔ میں اتنی دُور سے صرف ایک خوبصورت لڑکی کی خاطر نہیں آیا۔ میں ان تہوں کو توڑنے آیا ہوں۔ باہر نکل کر اپنے خدائوں کے کمرے بکھرے ہوئے دیکھو۔ انہیں انسان پاؤں تلے مسل رہے ہیں۔“

لیکن لڑکی مذہب میں ڈبلی ہوئی تھی۔ یہ مذہبی جنون ہی تھا کہ ماں باپ اُسے اتنی دُور سے سہرا لائے تھے۔ وہ مذہب کی تبدیلی سے جیسے کانپنے لگی تھی۔ ذوالقرنین نے اُسے دوسری صورت یہ بتائی کہ وہ جہاں جانا چاہے اُسے وہاں تک پہنچایا جائے گا لیکن مندر میں نہیں جانے دے گا۔ لڑکی پرتو خان، لڑائی خون اور لاشوں کی ادھاپنے والی باپ کی موت کی اتنی دُست طاری تھی کہ وہ ذوالقرنین کے خیمے سے باہر نکلنے سے بھی گھبرا رہی تھی اور

اسی شخص کو اپنا پاسبان سمجھنے لگی تھی۔

وہ تین چار دن غصے سے نہ نکل اور کوئی فیصلہ بھی نہ کر سکی۔ ذوالقرنین کو ستر اسے آگے جانے کا حکم مل گیا۔ جب رُکی نے دیکھا کہ وہ اکیل رہ گئی ہے تو اس نے ذوالقرنین سے بیتاب ہو کر کہا کہ وہ جہاں جا رہا ہے اُسے اپنے ساتھ لیتا چلے۔ ان تین چار دنوں میں رُکی نے دیکھ لیا تھا کہ یہ گھٹا جوا، دراز قد جوان بہت نیک آدمی ہے یا پھر ہے۔ وہ جو کچھ بھی تھا اس کو رُکی کے لیے فرستہ تھا۔

اُمی روز رُکی کو فوج کے امام کے پاس لے جا کر مسلمان کر لیا گیا۔ وہ رتن کماری سے رضیہ بن گئی اور سلار کی اجازت سے ذوالقرنین اور رضیہ کی شادی ہو گئی۔ غزنی کی فوج کے چند اہل حاکموں کی عیوب بھی ساتھ تھیں۔ رضیہ کو ان کے حوالے کر دیا گیا۔ ان عورتوں سے ذوالقرنین کو بہرہ چلا کر رضیہ اُسے فی الواقع فرشتہ سمجھتی ہے مگر اُسے یہ بھی بتایا گیا کہ وہ اسلام کے فرائض اور عبادت وغیرہ کو سمجھنے میں کچھ ہٹ یا دشواری محسوس کرتا ہے یا اُس نے اسلام کو دل سے قبول نہیں کیا۔

*

ایک سال گزر گیا تھا۔ ذوالقرنین اب باری میں مہاراجہ راجیا پال کے ساتھ تھا۔ راجیا پال تو جیسے مر ہی گیا تھا۔ وہ اب جنگجو نہیں صرف مہاراجہ رہ گیا تھا۔ اُس کے پاس غزانے کی کمی نہیں تھی۔ وہ مہاراجوں کی شان و شوکت سے رہتا تھا۔ ناچنے اور گانے والیاں بھی موجود تھیں۔ اُس نے نئے سرے سے حرم بھی بنالیا تھا۔ وہ غزنی کے فوجی افسروں کو جباری میں رہتے دیکھ کر رگ رگ کی مفلوں میں مدح و تحسین کرتا تھا لیکن ان میں سے کوئی بھی نہیں جاتا تھا۔

باری میں مندر بھی تھا۔ ہندوت اور برہمنی بھی آگئے تھے۔ سلطان محمود کے حکم کے مطابق وہ راجیا پال کے مذہب میں داخل نہیں دیا کرتے تھے۔ سلطان

نے حکم بھیجا تھا کہ اسلام کی تبلیغ کی جائے اور ان کے سامنے اسلامی کردار کا نمونہ پیش کیا جائے۔ یہ کام فوجی کر رہے تھے۔ دو چار دنوں بعد ایک دو ہندو اسلام قبول کر لیتے تھے۔ ذوالقرنین نے رضیہ سے بھی کہہ رکھا تھا کہ وہ ہندو عورتوں کو بتائی را کرے کہ مسلمانوں کا کردار کس قدر بلند ہے اور یہ بھی کہ اسلام کے احکام ہی ایسے ہیں کہ مسلمانوں کو اپنا کردار پاک اور بلند رکھنا پڑتا ہے۔

رضیہ اسی کردار کی پرستار تھی۔ اس نے مسلمان مرد کا کردار اپنی آنکھوں دیکھا تھا۔ وہ ہندو عورتوں کے ساتھ اسی کا ذکر کرتی رہتی تھی۔

غزنی میں سلطان محمود غزنوی سلطنت کے اُچھے چوٹے احمد سلجھانے میں مصروف تھا اور ان مسلمانوں کو اپنے محاذ پر لانے کی کوشش کرتا رہتا تھا جو اُس کے دشمن بنے ہوئے تھے مگر اُس کے کان ہندوستان کی طرف لگے رہتے تھے۔ وہ تھوڑی سی فوج کو ہندوستان کے دل میں بھجوا رہا تھا۔ مسہرا ہندو مت کا دل تھا۔ اسلام کا خیر اس دل میں اُتر رہا تھا۔ کبھی پہنچیں سنا تھا کہ ہندو راجے مہاراجے خاموش بیٹھے رہتے۔

سلطان محمود کو یہ بھی احساس تھا کہ ہندو لڑنے والی قوم ہے لڑنے والی نہیں۔ اُس نے دیکھا تھا کہ ہندو کس طرح جانیں قربان کرتے ہیں۔ ان میں غزابی یہ تھی کہ ان کے سالاروں کو لڑانے کا دھنگ نہیں آتا تھا۔ وہ لوٹ پڑنے اور کٹ مرے کو لڑائی کہتے تھے۔ اس کے مقابلے میں سلطان محمود کا شمار تاریخ کے مانے ہوئے ذہین جرنیلوں میں ہوتا تھا۔ اُس کی جنگی چالیں ایسی تھیں جو دشمن کو جال میں پھانس لیتی تھیں۔ دشمن کے پاس دم ہی چالیں رہ جاتی تھیں۔ وہ ہتھیار ڈال دے، ابھاگ اُٹھے یا دیواروں سے ٹکرانے کے انداز سے لڑے اور ختم ہو جائے۔

مذہب کے معاملے میں ہندو مسلمانوں سے کم نہیں تھے۔ ہندوؤں پر تو مذہب کا جنون طاری تھا۔ وہ مذہب کے نام پر لڑتے اور بے ہنگامی

سلطان محمود کے پیرو مشد شیخ ابوالحسن غرقانی نے اُسے کہا تھا۔
 ”دو قومیں ایک مٹی کی اور ایک سلجھنے کی بنی ہوئی ہیں۔ ایک یہودی اور دوسرے
 ہندو۔ اسلام دشمنی ان کی فطرت کا حصہ اور مذہب کا فریقہ ہے۔ جس دُور
 میں مسلمان ان سے غافل ہوئے یا انہیں دوست بنا بیٹھے، وہ دُور
 اُمّت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے زوال کا دُور ہے۔ تباہی و بربادی کا دُور
 کھو بیٹھنے کی۔ سلطنتوں اور ریاستوں میں بیٹے اپنے مسلمانوں کے حکماء و حکام
 کو رعایا بنالیں گے۔ ان کی زبانیں بند کر دیں گے اور انہیں ہندو اور یہودی
 کے خلاف بات کرنے سے روک دیں گے کیونکہ انہیں اپنی عمرانی اور بدامنی
 کا تحفظ اسلام کے ان دشمنوں کی خوشنودی میں نظر آئے گا۔ وہ اسلام کی
 تاریخ کا سیاہ دُور ہوگا۔ خدا کی یہ زمین مسلمانوں کے خون سے لال ہوتی
 رہے گی۔“

سلطان محمود اپنے اس روحانی پیشوا کی بات بڑی غور سے سُن رہا تھا۔
 اُس کی آنکھیں کھٹکھٹکی تھیں اور اُس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے
 تھے کہ اُس کی رُوح کانپ رہی ہے۔

”اور تمہاری اس سلطنت پر بے دین من مانی کریں گے۔ ابوالحسن غرقانی
 کہہ رہے تھے۔ غزنی، کابل، قندھار، گرویز، اُس قوم کے پاؤں تلے روئے
 جائیں گے جس کا کوئی دین نہیں اور جسے دین دانے مسلمان اپنا ہمدرد سمجھیں
 گے۔“

”یا شیخ و مُرشد بابا۔“ سلطان محمود نے ٹرپ کر کہا۔ ”قوم پر آنے والی بدبختیوں
 کو میں آج کیسے روک سکتا ہوں؟ میں کیا کروں؟“

”تمہارا مقبرہ اُن کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔“ شیخ غرقانی نے کہا۔ ”مستقبل
 کا خونی کھیل تمہارے اور میرے مقبروں کے ارد گرد کھیلا جائے گا۔ ہم کچھ
 نہیں کر سکیں گے کچھ کرنا ہے تو آج کر لو۔۔۔۔۔ اور وہ تم کر رہے ہو۔ میں
 نہیں یہ بتانا چاہوں گا کہ کیا نہ کرو۔ تم بار بار اُس ظلم میں جا رہے ہو

سے بڑتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ حق اور باطل کو نہیں سمجھتے تھے۔
 وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کی کُجرتی سے ہے اور وہ بچے خدا کے نام لیواؤں
 کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ انہیں کوئی بتاتا نہیں تھا کہ حق پرستوں کے ساتھ
 خدا ہوتا ہے۔ یہ حق پرستی کا ہی کرشمہ تھا کہ خدا نے سلطان محمود کو وہ عسکری
 فہم و فراست، جرات اور شجاعت عطا کی تھی جس کے آگے ہزاروں کے
 سینے بھی چاک ہو جاتے تھے۔

سلطان محمود کہا کرتا تھا کہ سانپ کو آخر کار انسان کے ہاتھوں مرنا
 ہی ہوتا ہے لیکن انسان چوکنار ہوتا ہے کہ سانپ بے خبری میں دُس نہ لے۔
 وہ ہندوؤں کو سانپ اور کچھو کہا کرتا تھا جن کی فطرت صرف دُشک مارنا تھا۔
 ”میں ہندوؤں سے غافل نہیں ہو سکتا۔“ اب بھی وہ اپنے سالاروں
 اور مشیروں وغیرہ سے کہہ رہا تھا۔ ”ان کے سُر ابھی کچلے نہیں گئے۔ میں ان
 کے ہتھیار اٹانے سے مطمئن نہیں ہو سکتا۔ سانپ بل میں چلا جائے یا اسے
 ٹوکری میں بند کر دو تو اس کی فطرت بدل نہیں جاتی۔ اس کا زہر ختم نہیں
 ہو جاتا۔ موقع ملتے ہی وہ دُشک مارے گا۔“

وہ اکثر کہا کرتا تھا۔ ”مجھے خدا اتنی لمبی عمر نہیں دے گا کہ میں مجھن تمام
 کی سرزمین کو ہندوؤں سے پاک کر سکوں۔ معلوم نہیں میرے بعد آنے
 والے ادھر توجہ دیں گے یا نہیں۔ اگر انہوں نے ہندو کے ساتھ دوستی
 کر لی تو یہ اسلام کے ساتھ دشمنی ہوگی۔ ہندو جب تک زندہ ہے اسلام
 کو کُستا رہے گا اور ہندوستان کی زمین مسلمانوں کے خون سے تر رہے
 گی۔ اُن کی مدد کو کوئی نہیں پہنچے گا۔ جنیں مدد کو پہنچا ہوگا اُن پر ہندو اپنی
 دوستی کا اور اپنے پیار کا فریب طاری کیے رکھے گا۔ ہندو اُس یہودی کی
 مانند ہے جو خداوند کے پاؤں دھوتی ہے اور اُس کے جسم کا حصہ بنی نظر آتی
 ہے مگر اُس کی دہ پردہ آشنائی کئی مردوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ وہ خاوند
 کے لیے پیار میں لیٹا ہوا فریب بنی رہتی ہے۔“

کریں۔ ایک دوسرے کے جسموں سے لذت حاصل کی جاسکتی ہے مگر فطرت اس لذت سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔“

✱

سلطان محمود نے ایسا حکم تو جاری نہیں کیا تھا کہ کوئی فوجی کسی ہندو عورت کے ساتھ شادی نہیں کر سکتا، البتہ اُس نے سالاروں اور فوج کے ساتھ جانے والے اماںوں سے کہا تھا کہ وہ فوجیوں کو ہندو لڑکیوں میں کچی نہ لینے دیں۔ اس کے باوجود بڑے ہی خاص حالات میں کوئی فوجی کسی ہندو عورت کے ساتھ شادی کر لیتا تھا۔ ان میں کما نذر ذو القرنین بھی تھا۔ اس لڑکی سے جو رتن کماری سے رضیہ بن گئی تھی، سالار ابو القدر سبجوتی بھی متاثر ہو گیا تھا اور امام بھی۔ لڑکی کسمیری کی حالت میں تھی۔ یہ خبر سلطان محمود تک پہنچ گئی تھی اور اُس نے کسی نمایاں ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔

ہندوستان سے قاصد باقاعدگی سے غزنی جا رہے تھے۔ ان کے ساتھ وہ رپوڑیں بھی سلطان کے پاس جاتی تھیں جو ہندوستان میں بکھرے ہوئے جاسوس فراہم کیا کرتے تھے۔ ان کے مطابق لاہور کا مہاراجہ اپنی فوج سمیت راجدھانی سے غائب تھا۔ وہ دریائے جمنہ اور گنگا کے دو آبہ سے باہر شمالی جنگلات میں کہیں روپوش تھا۔ جاسوسوں کو اُس کے ارادوں کا ابھی پتہ نہیں چلا تھا۔

امدادوں کی تکمیل کا منصوبہ کالجیہ میں بن رہا تھا۔ وہاں کے مہاراجہ گنڈہ کے محل میں گوالیار کا راجہ ارجن اور لاہور کا مہاراجہ ترلوچن پال بیٹھے تھے۔ ان کے ساتھ گوبند نام کا ایک ہندو اور کالجیہ کا بڑا پیٹنٹ بھی موجود تھے۔ ان کے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ مہاراجہ قنوج راجا پال دھوکہ دے گیا ہے اور اُس نے خود مختاری کے پردے میں سلطان محمود کی غلامی قبول کر لی ہے۔ وہ اس مسئلے پر بحث کر رہے تھے کہ راجا پال کو کس طرح سلطان محمود کے خلاف کیا جائے۔

جسے ہندوستان کہتے ہیں۔ وہاں زرد جوہرت ہیں۔ عورت کا حُسن ہے اور یہ حُسن بے حجاب ہے۔ وہاں کے بیز لپوڑوں میں حُسن ہے۔ اگر تم اور تمہارے سالاروں اور تمہارے کمانداروں نے اپنے ذہن و دل اس ظلم سے آزاد رکھے تو تم وہ قلعہ تعمیر کر سکو گے جس کی دیواروں سے کفر ٹکڑا ٹکڑا کر اپنا سر پھینکا رہے گا۔“

”کبھی کبھار میری فوج کا کوئی فرد کسی ہندو لڑکی کے ساتھ شادی کر لیتا ہے۔“ سلطان محمود نے کہا۔ اُسے باقاعدہ مسلمان کیا جاتا ہے۔ کیا یہ سلسلہ چلتا رہے یا اسے روک دوں؟

”ایک حکایت سنو گے محمود؟“ شیخ غرقانی نے کہا۔ ”میری جوانی میں میرے والد بزرگوار مرحوم و مغفور کا ایک سرید ہوا کرتا تھا۔ تاجر تھا اور بلند منہ۔ وہ مکی ملک سے چیتے کا پتہ لے آیا۔ میں نے دیکھا تھا۔ بڑا پیارا تھا۔ بلی کا بچہ لگتا تھا۔ وہ شخص اُسے گود میں بٹھا کر دودھ پلا کرتا تھا۔ اپنے بستر میں سٹلایا کرتا تھا۔ بچہ بڑا ہوا تو اُسے پرندوں اور غزال کا گوشت کھلایا کرتا تھا۔ وہ جدھر جاتا، چیتا اُس کے ساتھ ہوتا چیتے کو لینے مالک کی بو کے ساتھ بھی پیار تھا۔ ایک روز یہ شخص میرے والد بزرگوار کے پاس آیا۔ اُس نے اپنا بازو کھینچی سے کلانی نمک پانیوں میں باندھ رکھا تھا۔ کھینے لگا چیتے نے کاٹ کھایا ہے میرے والد نے کہا وہ تو تم سے پیار کرتا تھا۔ وہ شخص بولا، اُس نے پیار سے ہی کاٹا ہے لیکن دانت گوشت میں اتر گئے ہیں اور کھال اتر گئی ہے۔ بڑی شکل سے خون بند ہوا۔ جسم سے آدھا خون بہ گیا ہے۔۔۔“

”وہ چلا گیا تو والد نے مجھے کہا۔“ کچھ سمجھے ہو جن!۔۔۔ درندوں کے پیار میں بھی درندگی ہوتی ہے اور چیتا اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ انسان کو اپنا دشمن سمجھے۔“ محمود! ہندو اور یہودی وہ درندے ہیں جن کے پیار میں بھی درندگی ہے اور وہ اپنی فطرت سے مجبور ہیں کہ مسلمان کو اپنا دشمن سمجھیں۔ تم خود سوچ لو کہ مسلمان ہندو عورتوں کے ساتھ شادی کریں یا نہ

فوجی افسروں پر چھائے رہتے تھے۔ بعض علاقوں میں ان کا حکم چلتا تھا۔ اُس نے رانی کو ایسے پردے کے پیچھے برہنہ کھڑے دیکھا جہاں سے وہ نظر آرہی تھی، وہ آگ بگولے کی طرح اٹھا اور بہاراجوں سے مخاطب ہوا:

”آپ کہتے ہیں کہ رانی کیوں نہیں جاتی؟“ اُس نے ایسی آواز میں کہا جس میں غصہ بھی تھا، طنز بھی۔ ”میں کہتا ہوں رانی اسی حالت میں ہمارے سامنے کیوں نہیں آ جاتی تاکہ ہم اچھی طرح دیکھ سکیں کہ ایک ننگی، بے مذہب اور بے غیرت قوم کیسی ہوتی ہے۔ دو سال ہو گئے ہیں۔ تم نے باتوں کے سوا کیا کیا ہے؟ کیا یہ بہتر نہیں کہ تلواریں پنڈتوں اور عورتوں کو دے دو کہ وہ لڑیں اور تم یہاں شراب پیو اور نا پیسنے والیوں کے ساتھ رنگ ریاں مٹاؤ؟ اب تو دیوتاؤں کو ہتھاری قسموں کا بھی اعتبار نہیں رہا۔“ اُس نے اِدھر دیکھا اور بولا۔ ”پل جاؤ رانی! میں ان بہاراجوں کے ماتھوں پر پسینے کے قطرے دیکھ رہا ہوں۔ شاید مذمت کے یہ قطرے ان کے خون کو گرمادیں گے۔“

رانی چل گئی اور پیچھے ایسا سکوت پھوڑ گئی جس میں غرائی کی فوج کے لیے طوفان پرورش پا رہا تھا۔ تینوں بہاراجے ایک دوسرے سے آنکھ ملانے سے گھبر رہے تھے۔

”قتلے کے قلعے میں غرائی کی فوج کی نفری پوری ایک ہزار بھی نہیں۔“ پنڈت نے کہا۔ ”تم جلد کرو تو لڑائی کے بغیر اس نفری سے ہتھیار ڈال سکتے ہو۔ ان کی مدد کو کون آئے گا؟“

”ان ایک ہزار کو مار دو گے تو کیا حاصل ہوگا؟“ گوالیار کے راجہ ارجن نے کہا۔ ”محمود طوفان کی طرح آئے گا اور ایسا انتقام لے گا جسے ہندوستان کی تاریخ ہمیشہ یاد رکھے گی۔“

بحث جب زیادہ گرم ہوئی اور یہ سارا جے باتوں پر ہی زور دینے لگے تو ان کے درمیان سونے کی چوڑیاں آپڑیں۔ سب نے ادھر ادھر دیکھا۔ ان کی نظریں ذرا اوپر اٹھیں اور کمرے کے اندر کھینے والی شاہ نشین کے باریک ریشمی پردے پر زک گئیں۔ یہ شاہ نشین بالافانے پر تھکی۔ وہاں دھبہ عام کے دوران رانیاں اور راجھاریاں بیٹھا کرتی تھیں۔ اس باریک پردے کے پیچھے ایک عورت کھڑی نظر آرہی تھی جو ستر پاپا برہنہ تھی سب کی نظریں جھک گئیں۔

”یہ چوڑیاں ہیں تو۔“ پردے کے پیچھے سے عورت کی آواز آئی۔ ”نظریں مت جھکاؤ۔ میں تمہاری عزت ہوں۔ میں بھارت ماما ہوں۔ میں اندرا دوی ہوں۔ دیکھ لو مجھے۔ میں سبکی ہوں۔ تم نے مجھے ننگا کیا ہے۔ تم میں شرم نہیں رہی۔ نظریں کیوں جھکالی ہیں؟“ وہ ہماراج گندہ کی رانی تھی۔ گندہ غصے سے اٹھا۔

”یہاں سے چل جاؤ شکنت! اُس نے کہا۔“ میں اب تمہارے سامنے اُس وقت آؤں گا جب شوجی اور ہری کرشن ہماراج کی توہین کا انتقام لے چکوں گا۔ جب تک غرائی کا ایک بھی سپاہی بھارت ماما میں موجود ہے، مجھ پر تمہارا چہرہ اور جسم حرام ہے۔“

”تمہاری رگوں میں راجپوتی خون کی جگہ شرب دوڑ رہی ہے۔“ رانی نے کہا۔ ”تم غیرت والے ہوتے تو اس محل میں بیٹھے شراب نہ پی رہے ہوتے۔“

”تم ان جنگوں میں کیوں نہیں چلے جاتے جہاں تم نے ماؤں کے سپوت مسلمانوں سے مروا دیئے ہیں۔ تم ان مندروں کے طے تلے دب کر کیوں نہیں گئے جنہیں ناپاک مسلمانوں نے تباہ و برباد کر دیا ہے۔“

”رانی شکنت!“ ہماراج گندہ گرج کر بولا۔ ”تم یہاں سے چل کیوں نہیں جاتیں؟“

پنڈت اٹھ کھڑا ہوا۔ اُس ددر میں پنڈت بہاراجوں اور ان کے

”میں اس کی معافی مانگ لیتا ہوں“ پینڈت نے کہا۔ لیکن ہمیں یقین دلا دیں کہ اب آپ اپنی فوج سامنے لے آئیں گے اور اعلان کر دیں گے کہ آپ غزنی کے باجگزار نہیں ہیں۔“

اس فخل کی صورت اجلاس کی تھی۔ اجلاس کی صورت ہنگامہ خیز ہو گئی۔ تب وہ آدمی بولا جو فوجی نہیں تھا۔ اُس کا نام گو بند تھا۔

”اگر آپ جیسے دس اور ہزار بے اپنی فوجیں لے کے آجائیں تو بھی غزنی والوں کو شکست نہیں دے سکتے۔“ گو بند نے کہا۔ ”جو میں جانتا ہوں وہ آپ نہیں جانتے۔ کیا آپ میری عقل اور ذہانت کی تعریف نہیں کریں گے کہ قنوج کے قلعہ دار سالار ابو القدر سلجوتی کے ساتھ دوستی جتنی میری گھڑی ہے اتنی اُس کے لیے کسی آدمی کے ساتھ نہیں؟ وہ مجھے اپنا جاسوس سمجھتا ہے، مگر میں اُس کے سینے میں سے راز نکال کر آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔ میں آپ کی آنکھیں اور کان ہوں۔ یہ میں اس لیے جتا رہا ہوں کہ آپس کی حقیقت کو بھول کر آپ میری باتیں غور سے سنیں۔“

سب خاموش ہو کر اُس کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ سب گو بند کی قابلیت کے مداح تھے۔ وہ اُن کا جاسوس تھا۔ انہیں صبح اور بروقت خبریں دیتا رہتا تھا۔ اُس نے سالار ابو القدر کا اعتماد حاصل کر لیا تھا۔ اُس نے اپنا مذہب تبدیل نہیں کیا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ وہ مسلمان ہو گیا تو ہندو اسے اپنے قریب بھی نہیں بیٹھنے دیں گے۔ وہ دہری یا دروہی جاسوسی کر رہا تھا۔ اُس کے اس فریب سے نہ ہندو مارا بے واقف تھے نہ غزنی کے فوجی حکام جو قنوج کے قلعے میں مقیم تھے۔ وہ دونوں سے دولت سمیٹ رہا تھا۔

*

اب وہ مارا جوں کے اجلاس میں بیٹھا انہیں بتا رہا تھا۔ آپ پہلے ہی مشورہ زور کہہ چکے ہیں کہ قنوج پر حملہ کیا جائے کیونکہ وہاں غزنی کی فوج

”لڑائیاں لڑنا اور لڑانا آپ کے بس کی بات نہیں پینڈت جی ہمارا ج!“ — ہمارا ج گنڈہ نے کہا۔ ”میں سلطان محمود کی جتنی طاقت کو بیکار کرنا ہے۔ ہمیں یہ سوچنا ہے کہ ہم سب مل کر غزنی پر چڑھائی کر سکتے ہیں؟... ہمیں وہ فوج بند کرنا ہے جہاں سے یہ سیلاب آتا ہے۔“

”آپ کے لیے یہ ممکن نہیں“ پینڈت نے کہا۔ ”لاہور کے مہاراجہ ترلوچن پال آپ کے ساتھ بیٹھے ہیں۔ ان کے دادا مہاراجہ جے پال نے غزنی پر کتنے حملے کیے تھے اور اُن کا کیا حشر ہوا تھا۔ میں ناگزیر کھڑے ہو کر انہوں نے اپنے آپ کو زندہ جلا ڈالا تھا۔... میں مہاراجہ ترلوچن پال سے پوچھتا ہوں کہ مسلمان ستر کو صاف کر گئے، بلند شہر اور منچ کو تباہ کر گئے اور انہوں نے قنوج پر قبضہ کر لیا۔ ہمارا جلاہور نے کیا کیا؟ اپنی فوج کو قریب ہی فخل میں چھپائے رکھا اور دوسروں کو لڑنے کی شہ دیتے رہے۔“

”میں جو چاہاں چاہتا تھا اس کا مجھے موقع نہیں ملا۔“ لاہور کے مہاراجہ ترلوچن پال نے کہا۔ ”میں غزنی کی فوج پر عقب سے حملہ کرنا چاہتا ہوں مگر کسی بھی جگہ باقاعدہ نہ ہوا۔ محمڈ ایک ایک دن میں ایک ایک قلعہ فتح کرتا گیا۔ قنوج سے راجا پال پہلے ہی بھاگ گیا تھا۔ میں نے دشمن کی پیٹھ دیکھی ہی نہیں۔“

”ترلوچن مہاراج! — ہمارا ج گنڈہ نے کہا۔ ”مجھے آپ کی یہ چال پسند نہیں آتی۔ اگر آپ اپنی فوج غزنی کے سلطان کے راستے میں لے آتے تو وہ اتنی جلدی آگے نہ بڑھتا۔ حالات کچھ اور ہوتے۔“

”مارا ج ترلوچن پال کی چال کو میں سمجھتا ہوں۔ پینڈت نے کہا۔ ”یہ اپنی فوج گنگا جنا کے دو آبے میں صرف اس لیے لیے پھرتے رہے کہ جنگ کو لاہور سے دور رکھیں اور دوسروں کو لڑا لے رہیں۔“

ترلوچن پال بھرک اٹھا اور چلا چلا کر کہنے لگا کہ اُس کی توہین کی جا رہی ہے۔

گوبند کی اب کوشش یہ تھی کہ اُسے راجپال کے قتل کا موقع مل جائے
کیونکہ اسے بہت بڑے انعام کی توقع تھی مگر سالار سلجوتی نے اُسے اتنی ہی
اجازت دی کہ وہ راج محل کے ارد گرد جلا روک ٹوک گھوم پھر سکتا ہے،
تنہائی میں راجپال سے نہیں مل سکتا۔

سالار سلجوتی کے لیے گوبند کی لائی ہوئی اطلاعات قیمتی تھیں۔ اُس نے
گوبند کو انعام و اکرام دے کر کہا کہ وہ باری چلا جائے اور راج محل کے قریب
رہ کر مشکوک آدمیوں پر نظر رکھے، ہما نذر فدا القرنین کو سالار سلجوتی نے پیغام
بھیجا کہ راجپال سے کوئی اپنی جلتے آئے تو اُسے ملاقات کی اجازت نہ دی
جائے۔

بہمن چار روز بعد کالجہر کا پنڈت اچھی بن کر پہنچ گیا اور اُس نے راجپال
کو پیغام بھیجا کہ اچھی اُسے باہر ملنا چاہتا ہے۔ ذوالقرنین نے پیغام لانے والے
کو راجپال کے پاس جانے ہی نہ دیا۔ پنڈت مایوس ہو کر واپس جانے
لگا تو گوبند اُس کے پاس پہنچ گیا اور اُسے بتایا کہ راجپال مسلمانوں کا قیدی
ہے اور اُس پر باندیاں زیادہ ہو گئی ہیں۔ پنڈت نے اُسے کہا کہ وہ
راجپال کے قتل کا انتظام کرے۔

گوبند ہمارا جوں کا بھی رنگ خوار تھا۔ اُس نے ان پر مزید اعتماد پیدا
کرنے کے لیے پنڈت سے کہا کہ وہ راجپال کے بیٹے کچھن پال کو اپنے
ساتھ لے جائیں ورنہ سالار ابو القدر سلجوتی اُسے قید کر دے گا۔ گوبند نے پنڈت
کو بتایا کہ کچھن پال میں جوانی کا خون ہے۔ اُس نے کچھ ایسی حرکتیں کی ہیں جن
سے غزنی والوں کو اُس کی نیت پر شک ہو گیا ہے اور وہ اُس کی نظر بندی کی
باتیں کر رہے ہیں۔

وہاں سے گوبند کچھن پال کے پاس گیا اور اُسے بھی یہی باتیں بتائیں۔
کچھن پال چوری چھپے چلا گیا اور گوبند سے کہ گیا کہ وہ اس کے باپ کو قتل کرا
دے۔ اُس نے بھی گوبند کو ایسا انعام دینے کا وعدہ کیا جس سے گوبند بے واغ

”طریقہ کوئی بھی اختیار کیا جائے گا۔ گوالیار کے راجہ ارجن نے کہا۔ اور
کوئی بھی راجپال کو قتل کرے، میں اُسے سونے سے اور جاگیر سے لالامال
کردوں گا اور اُسے اتنی حسین لڑکی ہمیشہ کے لیے دے دوں گا جو اُس
نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھی ہوگی“

اُس نے گوبند کی طرف دیکھا اور اُسے کہا ”تم یہ کام کر سکتے ہو۔ تم
دہاں کے بھیدی کی ہو۔ کوئی راستہ، کوئی طریقہ نکال لو گے۔ پنڈت ہمارا راج
بھی چلے جائیں۔ دونوں میں جو بھی کامیاب ہو گیا وہ میری ریاست کا سب
سے زیادہ امیر اور سب سے بڑی جاگیر اور سب سے خوبصورت دائرہ کا
مالک ہوگا اس کے بعد ہم ملے کریں گے کہ تمیں کیا کرنا ہے“

چند دنوں بعد گوبند تنوچ کے قلعے میں سالار ابو القدر سلجوتی کے پاس بیٹھا
ہوا تھا اور اُسے بتا رہا تھا کہ کالجہر میں کیا منصوبہ بنا ہے۔ وہاں جہاں بھی ہوئی
تھیں وہ سب سنا دیں اور یہ بھی بتایا کہ ہمارا راجہ راجپال کے حفاظتی انتظامات
اور زیادہ سخت کر دیئے جائیں۔

”لاہور کے ہمارا جہر تلوچن پال کی فوج کہاں ہے؟“ سالار سلجوتی نے
پوچھا۔

”میاں سے زیادہ دور نہیں“ گوبند نے جواب دیا۔ ”ابھی یہ پتہ نہیں
چلا کہ کس مقام پر ہے۔ ہو سکتا ہے وہ لاہور واپس چلا جائے لیکن سب سے
زیادہ خطرناک آدمی وہی ہے۔۔۔ میں آپ سے ایک درخواست کرنا چاہتا
ہوں۔ راجپال کو یہ تمام ہمارے قتل کرنا چاہتے ہیں۔ آپ میں سے کوئی
بھی ہر ملازم، اسی فطریاد و بار کے ہر آدمی کو نہیں پہچانتا۔ میں سب کو پہچانتا
ہوں۔ کچھ اُس کے قریب کہیں رہتے دیا جائے۔ ہمیں ایسا نہ ہو کہ اُسے
کوئی دھوکے میں قتل کر دے۔ اس کے بیٹے کچھن پال کو اس سے دور رکھا
ٹائے اور اُس پر کڑی نظر رکھی جائے“

پر ایسا احسان کیا ہے کہ وہ اُسکی کی ہو کے رہ گئی ہے۔

گوبند کے کان کھڑے ہوئے۔ اُس کا دماغ شیطانت سے بھرا ہوا تھا اور وہ بڑا ذہین انسان تھا۔ وہ اس سوچ میں کھو گیا کہ کیا اس لڑکی کو راجپال کے قتل کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے؟

سوچ سوچ کر اُس کے دماغ میں ایک ترکیب آگئی۔ اُس نے پنڈت سے کہا کہ اُسے وہ اُن عورتوں سے ملا دے جن کے ساتھ وہ دل کی باتیں کیا کرتی ہے۔ پنڈت نے اُسے بتایا کہ وہ دو عورتوں کے ساتھ دریا میں نہانے کے لیے بھیجی جا رہی ہے اور ذوالقرنین کو اس پر پورا بھروسہ ہے۔

دو تین روز بعد رضیہ دو ہندو عورتوں کے ساتھ دریا کی طرف جا رہی تھی۔ راستے میں درختوں اور جھاڑیوں کا جنگل تھا۔ ایک درخت کے نیچے ایک آدمی سر جھکا کر بیٹھا تھا۔ اُس کی لمبی داڑھی تھی اور سر کے بال کندھوں پر بڑے ہوئے تھے چہرے سے وہ مسلمان لگتا تھا مگر اُس کے لباس اور چلنے سے شک ہوتا تھا کہ وہ ہندو سادھویا رہی ہے۔ اُس نے رضیہ اور اُس کے ساتھ دو عورتوں کو دیکھا تو مبرا اٹھایا۔ وہ انہیں بڑی غور سے دیکھ رہا تھا جب عورتیں اس کے قریب سے گزریں تو اُس نے انگلی اُپر اٹھا کر انہیں رکنے کا اشارہ کیا۔ وہ رکیں تو اُس نے انہیں بٹھالیا اور نظریں رضیہ کے چہرے پر گاڑ دیں۔

رضیہ کی نظریں جیسے اس شخص کی نظروں میں جکڑی گئی ہوں۔ وہ لڑکی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے تھا۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھ رضیہ کے سر پر رکھ دیئے اور دونوں آنکھوں سے اس کی پیشانی کو آہستہ آہستہ ملنے لگا۔ عورتوں نے دیکھا کہ رضیہ کی آنکھیں کھل گئیں تھیں اور وہ سادھو کی آنکھوں میں ٹکلی باندھے ہوئے تھی۔ اُس پر جیسے کتہ طاری ہو گیا تھا۔

سالار ابوالقادر سلجوتی نے ایک قاصد غزنی کو اس رپورٹ کے ساتھ روانہ کر دیا جو اُسے گوبند نے دی تھی۔ اُس نے پیغام میں یہ بھی لکھوایا کہ یہاں کے مہاراجوں کا کوئی بھروسہ نہیں بہتر ہو گا کہ فوج کا ایک سواری دستہ بھیج دیا جائے تاکہ محاصرے یا حملے کی صورت میں مزید فوج آنے تک دشمن کو روکا جاسکے۔ ادھر گوبند نے راجپال کے راج محل میں آنے جانے کی اجازت حاصل کر لی تھی اور وہ اب اس سوچ میں رہنے لگا کہ راجپال کو کس طرح قتل کیا جائے۔ وہ چونکہ ہندو تھا اس لیے اُس کا اٹھنا بیٹھنا ہندوؤں کے ساتھ تھا۔ وہ مندر میں بھی جاتا تھا۔ وہ چونکہ جاسوس تھا اس لیے اُس نے مندر کے پنڈت کے ساتھ گھر سے مراسم پیدا کر لیے تھے اور اُس کے ساتھ راجپال اور سلطان محمد کی باتیں بھی کر لیتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو مذہب پرست ظاہر کرتا تھا۔

ایک روز پنڈت نے اُسے بتایا ”ایک ہندو لڑکی ہے جو مسلمان ہو چکی ہے اور اب کاہنہ ذوالقرنین کی بیوی ہے۔ مجھے ہندو عورتوں نے بتایا ہے کہ وہ مسلمان تو ہو گئی ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ہندومت اس کے دل سے پوری طرح نہیں نکلا۔ عورتیں بتاتی ہیں کہ اپنے خاوند کے ساتھ اُسے اتنی زیادہ محبت ہے کہ اُس کے مذہب کو اپنا مذہب سمجھتی ہے مگر جب وہ خاوند سے ہٹ کر امد گرد دیکھتی ہے تو ہندو نظر آتی ہے۔ اُس نے عورتوں کو یہاں تک کہا ہے کہ اُس کے خاوند نے اُسے یہ کب رکھا ہے کہ وہ ہندو عورتوں میں اسلام کی تبلیغ کرتی رہا کرے۔ اس بہانے وہ ہندو عورتوں میں اٹھتی بیٹھتی ہے لیکن اسلام کی کوئی بات نہیں کرتی۔۔۔ میں سوچا کرتا ہوں کہ اسے کس طرح اس مسلمان سے نجات دلائی جائے۔ دراصل ہندومت اس کے خون میں بچپن سے شامل کر دیا گیا تھا۔ ذوالقرنین نے اس

”روح بھٹک رہی ہے۔“ سادھو نے ایسی آواز میں کہا جو بلند سرگوشی تھی۔ ”روح کہیں اور ہے جسم کہیں اور ہے۔ روح پاک جسم ناپاک ہے۔ ایک آنکھ میں کشن مرادی دوسری آنکھ میں گھپ اندھیرا ہے۔ اگلا جسم برا کھن ہے۔ لومڑی کا روپ ملے گا۔ لوگ سٹار لومڑی کہیں گے۔“

وہ اچانک جیسے بیدار ہو گیا ہو۔ اُس نے سر جھٹک کر کہا۔ ”جلو...“
پہلے جلو... ایسی روچیں بھی ہوتی ہیں۔ ”وہ پریشان اور مضطرب ہو گیا اپنے آپ سے بائیں کرنے کے لمحے میں کہنے لگا۔ ”میں نہیں دیکھ سکتا۔ تم نہیں دیکھ سکو گی۔ ایک آنکھ کے اندھیرے میں کیا ہے؟... تم برداشت نہیں کر سکو گی... جاؤ... مندر اور مسجد کے درمیان اندھیرا ہے۔ اس میں ٹھوکریں کھاتی رہو۔ اپنا انجام مرت یو جیو۔ سونگی تو سر جاؤ گی۔ مرو گی نہیں تو پاگل ہو جاؤ گی۔“

اُس کی پریشانی، بے چینی اور اضطراب میں اور انداز میں پرامبراز تاثر تھا اور جس طرح اُس نے رضیہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سترنم سہی سرگوشی میں بات کی تھی، اس میں کچھ ایسا اثر تھا جیسے رضیہ پیناٹاٹز ہو گئی ہو۔ وہ فطرۃ ہند تھی۔ اس کے ساتھ ہندو عورتیں تھیں۔ ہندو تو ہم پرست قوم ہے اور تو ہم پرستی ان کا مذہب ہے۔ ان پر ایسا تاثر طاری ہو گیا کہ وہ سادھو کے آگے سے اٹھتی ہی نہیں تھی۔ رضیہ کو نذالقرین کی محبت نے مسلمان کو کر لیا تھا لیکن اُس کی فطرت سے ہندومت نہیں نکلا تھا۔ سادھو کے اشارے واضح تھے۔ وہ سمجھ گئی کہ اُس نے مسلمان ہو کر گناہ کیا ہے اور اس کی سزا اُسے یہ ملے گی کہ اگلے جنم میں وہ لومڑی بنے گی۔ یہ بھی ہندوؤں کا عقیدہ ہے۔

ان عورتوں نے سادھو کی مٹھی چابی شروع کر دی۔ وہ بولتا ہی نہیں تھا۔ بولا تو اُس نے بھیجن گنگنا نے شروع کر دیئے۔ بڑی مشکل سے اُس نے بات کی۔

*

”اس لڑکی (رضیہ) کو دریا پرست لے جاؤ۔“ سادھو نے ٹھہر آواز میں کہا۔ ”سٹر کا مگر کچھ اسے سالنگ لے لینے کے لیے آگیا ہے۔ ہم نے ویسے ہی اس لڑکی کو نہیں دیکھا تھا۔ ہوا میں ایک بو آئی تھی جسے دنیا کا کوئی انسان نہیں سمجھ سکتا۔ یہ اُن بدروحوں کی بو ہوتی ہے جو اپنے گناہوں کی آگ میں جل رہی ہوتی ہیں۔ تم قریب آئیں تو یہ بو ہمیں اس لڑکی کے جسم سے آئی۔ اس کی روح جو مرنے کے بعد بدروح بن جائے گی، زندگی میں ہی چل رہی ہے۔“

رضیہ نے گھبراہٹ اور خوف کے لمحے میں کہا۔ ”اُم ریشی جی! میں گناہگار ہوں۔ میں بہت بے چین ہوں۔ ایک وہ انسان ہے جس نے میرے دل پر قبضہ کر لیا ہے، دوسرا قبضہ میرے مذہب کا ہے۔ میں نادان اور مجبور ہوں۔“

”مگر پاپ جو ہو چکا ہے اس کی سزا سے کیسے بچو گی؟“
”کیسے بچوں گی؟۔ رضیہ نے پوچھا۔“ مجھے بتائیں آپ ہی بتائیں روح کو سزا سے بچانے کے لیے میں اپنا جسم چتا پر جلاؤں گی۔ اگلے جنم کے عذاب سے بچنے کے لیے میں اپنی جان کی قربانی دے دوں گی۔“
”ہم بتاتے درتے ہیں۔“ سادھو نے کہا۔ ”ہمت ہے تو سنو۔ پانی سے دُور رہو۔ قربانی ایک جان کی دینی ہے لیکن وہ جان تمہاری نہیں ہو گی۔“ سادھو نے آنکھیں بند کر لیں اور اُس کے ہونٹ ہلکے رہے۔

کچھ دیر بعد بولا۔ ”بہت بڑے آدمی کا خون کرنا ہے... ہمارا جہ کا خون۔ پانی کا خون۔ ایسے ہمارا جہ کا خون جس نے اپنے بھگوان کو مسلمانوں کے حو لے کیا اور آج اُن کی نظر بندی میں خوش ہے... سنو لڑکی! سخت چاہتی ہو تو اپنے مہاراجہ کو قتل کرو، پھر اپنے خاوند کو قتل کرو۔ پہلے مہاراجہ کے خون کا ٹکٹ اپنے ماتھے پر لگاؤ، پھر اس پر اپنے خاوند کے خون کا ٹکٹ لگاؤ، پھر مندر میں چلی جانا۔ تمہیں ایک اشارہ ملے گا۔ روشنی نظر آئے

گی۔ یہ تہذیبی سہولت کی نشانی ہوگی۔
”قتل؟“ رضیہ کی آنکھیں کھل گئیں۔ اُس نے سرگوشی کی۔
”قتل؟... نہیں۔“

”راجپوت کی بیٹی کو قتل کرنے سے ڈرتی ہے؟“ سادھو نے
کہا۔ ”اگر ڈرتی ہے تو نہ کہہ۔ جل۔ مگر کچھ کالوالہ بن اور لو مڑی بن کے
والیس آ۔ اسی مہاراجہ کے کتے تہذیبی شکار کریں گے۔ اسی مہاراجہ
کے تیر سے تم زخمی ہوگی۔ مردگی نہیں۔ جسم میں تیر لیے ہوئے زندہ رہو
گی۔ زخم میں پیپ پڑے گی۔ اس میں کیرے پڑیں گے۔ تم جنگلوں میں
جتنی چلتی پھرتی ہوگی۔“

”مہاراج!۔ ایک عورت نے کہا۔“ دیوتاؤں کا حکم مالا نہیں جاسکتا۔
اسے قتل کا کوئی ایسا طریقہ بتادیں جو آسان ہو اور یہ پکڑی بھی نہ جائے۔“
سادھو نے اپنے غمور اور بڑا سر ابلے اور انداز میں رضیہ کو جو طریقہ بتایا وہ
یہ تھا کہ راجا پال عورتوں کا شکاری اور شیدائی تھا۔ رضیہ خوبصورت اور جوان
لڑکی تھی۔ وہ مہاراجہ کے سامنے جانے اور اپنی نمائش کرے چونکہ رضیہ
مسلمان کماندار کی بیوی تھی اس لیے یہ اسکاں تھا کہ راجا پال اس پر ہاتھ
نہیں ڈالے گا۔ یہ کام رضیہ کا تھا کہ راجا پال کو اپنا آپ پیش کرے اور اُس
کی خواب گاہ میں اس طرح جائے کہ اُسے کوئی دیکھ نہ سکے۔ ہاتھ میں خنجر لے
جائے اور اُسے ختم کر آئے۔ پھر اپنے خاوند کو اسی طرح قتل کر کے مندر میں
جلی جائے۔ وہاں پنڈت اسے کہیں دور بھیج دے گا۔

”کیا میں اتنی جرات کر سکوں گی؟“ رضیہ نے پوچھا۔

سادھو نے اپنے پاس رکھی ٹوٹی ایک ٹوکری میں سے ٹول کر ایک ڈیرہ
نکالی اور کھولی۔ اس میں سفوف سا تھا۔ اُس نے ذرا سفوف ایک کپڑے
میں باندھ کر رضیہ کو دیا اور کہا کہ جب قتل کرنے کے لیے روانہ ہوگی تو یہ سفوف
ایک گھونٹ پانی میں ملا کر پی لینا۔ جرات اور دلیری آجائے گی۔

اُسی شام مندر میں گوبندان دو عورتوں کے پاس بیٹھا تھا۔ وہ اُسے بتا
رہی تھیں کہ رضیہ ان کے ساتھ دریا پر جلنے کی بجائے واپس آگئی تھی۔
”اے کچھ شک تو نہیں ہوا؟“ گوبند نے پوچھا۔

”شک تو ہم دونوں کو بھی نہیں ہوا تھا جو اچھی طرح جانتی تھیں کہ یہ تم
ہو۔ ایک عورت نے کہا۔“ تہذیبی روپ پوری طرح کامیاب تھا۔ اس کے
بعد ہم نے لڑکی کو کوئی ایک کمانیاں بنا کر قاتل کر لیا ہے کہ وہ کام کر دے۔“
رضیہ کو قاتل کرنے کی اتنی زیادہ کوشش کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ سہارا
اور تائید جانتی تھی جو اُسے مل گئی۔ ذوالقرنین نے اُسے کہا تھا کہ وہ ہندو عورتوں
میں اسلام کی تبلیغ کیا کرے مگر ہندو عورتوں نے اس سے اپنا پیدائشی اور
آبائی رنگ اُترنے نہ دیا۔ اور اُگل ہی رات جب ذوالقرنین دن بھر کی کشت اور
دھڑکاموں کا تھکا ہارا انگری نیند سویا ہوا تھا رضیہ کے سینے میں تن کا رگی چل
اٹھی۔ اُس نے اُٹھ کر پانی میں وہ سفوف ملا یا جو اُسے سادھو نے دیا تھا اور
بڑی تیزی سے پانی پی لیا۔ اُس پر گھبراہٹ اور سچائی کی کیفیت طاری تھی۔ وہ
دہیں کھڑی چاندنی سے روشن غلامیں گھومتی رہی۔ آہستہ آہستہ گھبراہٹ اور
ہیجان میں کمی آنے لگی۔ سرور طاری ہونے لگا اور پھر لڑکی اپنے اندر ایسی قوت
محسوس کرنے لگی جیسے وہ غزنی پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہو گئی ہو۔

ایک ہی روز پہلے اُس نے اپنے خاوند ذوالقرنین سے کہا تھا کہ وہ راج محل
کی عورتوں کے پاس جانا چاہتی ہے اور وہ کوشش کرے گی کہ وہاں کی عورتوں کو
مسلمان بنا سکے۔ ذوالقرنین خوش ہو کہ رضیہ تبلیغ کا کام دیکھی سے کر رہی ہے۔
وہ گئی۔ راج محل میں سب جانتے تھے کہ وہ مسلمان کماندار کی بیوی ہے۔ وہ
عورتوں کے پاس جاتے جاتے مہاراجہ راجا پال کے کمرے میں چلی گئی۔ راجا پال
اُسے دیکھ کر صرف اس لیے خوش نہ ہوا کہ وہ کماندار کی بیوی ہے بلکہ اس لیے
زیادہ خوش ہوا کہ وہ خوبصورت لڑکی ہے۔ اُس نے لڑکی کو تپاک اور احترام
سے بھایا۔

وہ جس راستے سے کمرے میں داخل ہوئی تھی، اُسی راستے سے باہر نکل گئی اور بڑے اطمینان سے چلتی اپنے گھر پہنچ گئی۔ وہاں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں خون آلود خنجر تھا۔ اب اسے اپنے خاوند کو قتل کرنا تھا۔ کھلے ہوئے درپے میں سے چاندنی ذوالقرنین کے چہرے اور سینے پر پڑ رہی تھی۔ وہ گہری نیند سو رہا ہوا تھا۔ اُس کا سینہ اُپر تھا۔ دل رملک ہی وار کافی تھا۔

رضیہ آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔ اُس نے خنجر والا ہاتھ ہوا میں بلند کیا۔ اُس کی نظریں ذوالقرنین کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ذوالقرنین جانے کیا خواب دیکھ رہا تھا کہ وہ مسکرایا۔ رضیہ کے اندر ایسی تبدیلی آئی جیسے وہ خواب سے بیدار ہو گئی ہو۔ ذوالقرنین کی محبت نے سفوف کا اثر نائل کر دیا اور اس اثر کو زائل کرنے میں شراب نے بھی کام کیا تھا۔ رضیہ کا ہاتھ کانپا اور ہاتھ سے خنجر چھوٹ کر ذوالقرنین کے پیٹ پر گرا۔ وہ جاگ اٹھا اور رضیہ اس کے اوپر گر پڑی۔ وہ مدہری تھی۔

ذوالقرنین نے تیزی سے اٹھ کر دیا جلایا۔ وہ اپنے بستر پر خون آلود خنجر بڑا دیکھ کر حیران رہ گیا۔ رضیہ چہرہ ہاتھوں میں پھسائے ہوئے سکیاں لے رہی تھی۔ ذوالقرنین نے اُسے اٹھایا اور پوچھا کہ یہ سب کیا ہے۔
”میں تمہیں قتل نہیں کر سکتی۔“ اُس نے روتے ہوئے کہا ”میں اپنے دل میں خنجر نہیں اُتار سکتی۔“

اُس نے ذوالقرنین کو بتایا کہ وہ ہمارا جہاں کو قتل کر آئی ہے اور اب اس کے ہاتھ سے ذوالقرنین کو قتل ہونا تھا۔ اُس نے بتایا کہ کس طرح وہ دھڑکنے کے ساتھ دریا میں نہانے جا رہی تھی کہ اُسے ایک سادھو ملا۔ اُس نے سادھو کی باتیں سنائیں۔ ان عورتوں نے اُسے جس طرح راجا پال کے لیے تیار کیا تھا، وہ بھی بتایا۔ سفوف کا بھی ذکر کیا۔

”میں نے تمہاری محبت کو قبول کیا تھا، تمہارے مذہب کو نہیں۔“

تھوڑی ہی دیر میں وہ اس طرح باتیں کر رہے تھے جیسے وہ ایک مدت سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ اجنبیت لڑکی کے اس انکشاف نے ہڈ کر دی تھی کہ وہ ہندو تھی اور مسلمان ہو گئی ہے مگر اُس نے دل سے اسلام کو قبول نہیں کیا۔ اجنبیت کے ساتھ ساتھ شرم و حجاب بھی اٹھ گیا۔ لڑکی کا ارادہ چڑھ گیا اور تھا اس لیے اُس نے کہا کہ وہ رات کو آئے گی لیکن ایسے راستے سے کہ اسے کوئی آتے جاتے نہ دیکھ سکے۔

راجا پال بھی یہی چاہتا تھا کہ لڑکی کو کوئی نہ دیکھ سکے۔ پکڑے جانے کی صورت میں راجا پال کو معلوم تھا کہ ذوالقرنین دونوں کو قتل کر دے گا۔ چنانچہ راجا پال نے اُسے محفوظ راستہ اسباب اور کمرہ دکھا دیا۔

اگلے ہی رات رضیہ اُس راستے سے اُس کمرے میں پہنچ گئی جو راجا پال نے اُسے دکھایا تھا۔ راجا پال نے اُسے کہا کہ وہ شراب تو نہیں پئے گی کیونکہ اُسے خاوند کے پاس جانا ہے۔ رضیہ نے اُسے کہا کہ وہ خود ہی ڈالے اور خود ہی پیے۔ راجا پال کھڑا تھا۔ وہ جھک کر پیالے میں شراب ڈال رہا تھا۔ رضیہ سفوف کے اثر میں تھی۔ اُس نے کمروں کے اندر سے خنجر نکالا اور ہاتھ اوپر کر کے خنجر راجا پال کی پیٹھ میں اتار دیا۔ اُس نے خنجر کھینچا۔ اس کے ساتھ ہی راجا پال سیدھا ہوا۔ اُس کے منہ سے ابھی آواز بھی نہیں نکلی تھی کہ رضیہ نے اُس کے دل پر وار کیا۔ رضیہ نے خنجر کھینچا اور اس کے ساتھ ہی راجا پال منہ کے بل گر پڑا۔ رضیہ نے اُسے دیکھا۔ وہ ذرا سا بلا پھر بے حس ہو گیا۔ رضیہ کو جیسے احساس ہی نہیں تھا کہ اُس نے ایک انسان کو قتل کر دیا ہے۔ انسان بھی کوئی معمولی آدمی نہیں، مہاراجہ تھا اور وہ غزنی کے اُس سلطان کا دوست تھا جس نے ہندوؤں کی چلی طاقت کو اسی طرح توڑ پھوڑ ڈالا تھا جس طرح اُس نے باطل کے بت توڑے تھے۔ رضیہ نے عجیب سا اطمینان محسوس کیا۔ یہاں تک کہ اُس نے وہ پیالہ اٹھایا جس میں راجا پال نے شراب ڈالی تھی۔ اُس نے پیالہ

اٹھایا اور منہ سے نکال دیا۔ اس سے پہلے اُس نے کبھی شراب نہیں پی تھی۔

ایک شکست خوردہ مہاراجے کا قتل اسنا اہم واقعہ نہیں تھا کہ سلطان محمود کو اس کی اطلاع دی جانی مگر اہم اور فوری توجہ کا طالب اس واقعہ کا پس منظر تھا اور ہندوستان کے مہاراجوں کے ارادے بڑے خطرناک تھے۔ سلجوقی نے غزنی کو ایک تیز رفتار قاصد بھیج دیا۔

سلطان محمود نے جب اس قاصد کی زبانی پیغام سنا تو اُس نے اُکی وقت اپنی فوج کو ہندوستان کی طرف کوچ کی فوری تیاری کا حکم دے دیا۔

تین چار روز بعد غزنی کی فوج ایک تاریخی جنگ لڑنے کے لیے غزنی سے روانہ ہوئی۔ ادھر گوالیار، کانجرا اور لاہور کی فوجیں فیصلہ کن جنگ لڑنے کے لیے تیار ہونے لگیں۔

رضیہ نے کہا: ”میں نے مجھے خدا کی عبادت سکھائی اور پڑھائی تھی مگر میں تمہارے خدا کی بجائے تمہاری عبادت کرتی رہی۔ مجھے بچپن سے بتایا جاتا رہا ہے کہ مسلمان ناپاک ہوتے ہیں۔ تمہارے دلوں میں مسلمانوں اور اسلام کے خلاف نفرت پیدا کی جاتی ہے۔ میں تم سے نفرت نہ کر سکی۔“ اُس نے ایک کرخیز اٹھایا اور ذوالقرنین کی طرف بڑھا کر کہا: ”مجھے اپنے ہاتھوں قتل کر دو۔ میں زندہ نہیں رہنا چاہتی۔“

ذوالقرنین نے اس کے ہاتھ سے خنجر لے لیا اور اُسے کہا کہ وہ زخمی ہے گی اور اُس کا دل گواہی دے گا کہ اسلام سچا مذہب ہے اور مسلمان ناپاک نہیں ہوتے۔ اُس نے بڑی مشکل سے رضیہ کو سنبھالا۔

دوسرے دن ذوالقرنین نے ایک قاصد فوج کو سالار ابو القدر سلجوقی کے لیے اس پیغام کے ساتھ موڑا دیا کہ راجپال قتل ہو گیا ہے۔ رضیہ کی نشاندہی پر ان دو عورتوں کو کبڑا گیا جو رضیہ کے ساتھ دریا گئی تھیں۔ انہیں ڈرا دھمکا گیا تو انہوں نے گوبند کو کبڑا دیا۔ گوبند نے ان عورتوں اور رضیہ کے ساتھ لاشعلقی کا اظہار کیا۔ ذوالقرنین نے دو گھوڑے منگوائے۔ گوبند کے ٹخنوں سے الگ الگ رستے بانڈھ کر گھوڑوں کے ساتھ بانڈھ دیئے گئے۔ سواروں سے کہا گیا کہ وہ گھوڑے چلا دیں۔ ایک گھوڑا دائیں کو چلا اور دوسرا بائیں کو۔ پیشتر اس کے کہ گوبند کی ٹانگیں جسم سے الگ ہو جاتیں، وہ درو سے بلبل اٹھا۔ گھوڑے روک لیے گئے۔ اُس نے بتا دیا کہ راجپال کو اُسی نے قتل کر لیا ہے اور گوالیار اور کانجرا کے مہاراجوں نے اسے انعام پیش کیا تھا۔ اس نے مہاراجوں کا تمام تر منصوبہ بھی بتا دیا، اور یہ بھی کہ وہ دو غلا جاسوس ہے۔ سالار ابو القدر سلجوقی آگیا۔ اُس نے سارا واقعہ سن کر گوبند سے کہا کہ وہ بھاگ جائے۔ گوبند حیران سا ہو کر چلا تو سلجوقی نے اپنے ایک محافظ سے کہا کہ اس میں تیر ڈالا اور دوسرے لمحے تیر گوبند کی پیٹھ میں اتر اُٹھا۔ سالار سلجوقی نے حکم دیا کہ اسے گھسیٹ کر دُور پھینک آؤ۔

اُس قوم کے تدسوں تلے روندنے جارہے ہیں جس کا کوئی دین نہیں اور جسے وہاں کے مسلمان حکمران اپنا ہمدرد سمجھتے ہیں۔

کیوں؟ ایسا کیوں ہوا؟ حریت کے چراغوں کی روشنی کہاں گئی؟
حریت کے چراغِ فتنہ کے لہو سے روشن رہا کرتے ہیں۔ وہ لہو بک گیا،
وہ ایمانِ اسلام ہو گیا اور شہیدوں کا لہو جسے زمین نے مضمت کر لیا ہوتا تاریخ
کے ساتھ ہم نے بے انصافی کی کہ تاریخ نے محلوں کے ساتھ بے انصافی کی۔ یہ ہمارے
دین کے دشمن کا کمال ہے کہ اُس نے بہت دشمن کو بُت فروش ثابت کر دیا۔
حق کے علمبردار کو لٹیرا کیا اور تاریخ کے منہ میں جھوٹ ڈال کر جھوٹ کو ترجیح
کھوایا۔ سبق جو ہم بھلا نہ کھٹھتے تھے، وہ ہمارے دشمن نے یاد رکھا اور دشمن
نے یہ بھی یاد رکھا کہ کسی قوم کو دقت اور شجاعت سے محروم کرنا ہوتا اُس کی
تاریخ سے درنشاں باب پھاڑ کر ان کی جھوٹیں و عشرت اور جہانی لذت
پرستی کے افسانے رکھ دو۔

ہمارے دشمن نے ہمیں تاریخ سے بیگانہ رکھا۔ لہو کی تحریروں کو شہرِ آب سے
دھو ڈالا۔ جذبوں پر حسدیت کا فسوس طاری کر دیا، پھر ہم بھول گئے کہ ہم کیا
تھے اور ہمارے خزانے کیا تھے۔ ہم ایسا دھرتی پر بدست ہو کر چلے گئے
جس میں محمد بن قاسم کے سرفروشاں، کالہوٹا ہوا ہے اور جس کی مٹی میں غزنی
کے شہیدوں کی بوساں چلی بسی ہوئی ہے۔ یہی وہ بوساں ہے جو قوم کو اور
اُبھرتی ہوئی انسانوں کو طوفانِ بگڑیاں اور باطل کے خلاف موڑ کر رکھتی ہے۔
قوم ہی یوں ہے دقت سے زندہ ویدار رہتی ہے جو اپنے شہیدوں کے لہو کی
تحریروں کو بھٹنے نہیں دیتی۔ انہیں اپنے لہو سے شمع اور تروتازہ رکھتی ہے۔
آباد اجداد کے نقوش پا کو بٹنے نہیں دیتی۔ ان پر اپنے نقش ثبت کر کے انہیں
اپنے پیچھے آنے والوں کے لیے نمایاں رکھتی ہے۔
دشمن نے ہماری تاریخ سے وہ ورق پھاڑ ڈالے جن پر لکھا تھا کہ جہان

یہ معجزہ تھا

نوحیدیاں
اور ستر سال گزرے، سلطان محمود غزنوی
کے مُرشداور روحانی پیشوا شیخ ابوالحسن
فرقانی نے اُسے کہا تھا۔ ”جس دور میں مسلمان، ہندو اور یہودی سے غافل
ہوئے یا انہیں دوست بنا بیٹھے، وہ اُمتِ رسولؐ کے زوال کا دور ہو گا۔“
.... وہ اسلام کی تاریخ کا سیاہ دور ہو گا۔ خدا کی یہ زمین مسلمانوں کے خون سے
لال ہوئی رہے گی۔ ہمتاری اس سلطنت (غزنی) پر بے دین مسلمان
کریں گے۔ غزنی، کابل، قندھار، گردیز اُس قوم کے پاؤں تلے روندے
جائیں گے جس کا کوئی دین نہیں اور جسے یہاں کے مسلمان اپنا ہمدرد سمجھیں
گے۔ ہمتاری مقررہ ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ مستقبل کا خون کھیل نہائے
اور میرے مقبروں کے ارد گرد کھیلا جائے گا۔ ہم کچھ نہیں کر سکیں گے کچھ کرنا
ہے تو آج کر لو۔“

سلطان محمود غزنوی نے اپنی باری عمر باطل کے خلاف لڑتے یہاں
جنگ میں گزار دی۔ آخر میں وہ سب دق کا مریض ہو گیا تو اُس نے اپنے
طبيب کو مکتی سے کہہ دیا کہ کسی کو پتہ نہ چلے کہ سلطان کو دق تیزی سے کھانا
ہے۔ اُس کے پیرو مشد نے اُسے کہا تھا کہ کچھ کرنا ہے تو آج کر لو۔ اُس
نے اپنے آج کا آرام اور سکون اور اپنا ہم ملت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کے کل پر قربان کر دیا، مگر آج غزنی اور ہرات میں اُس کے اور اُس کے
روحانی پیشوا کے مقبروں کے ارد گرد ایک بے دین قوم خون کھیل کھیل رہی
ہے اور مسلمانوں کی دھجیاں اُڑ رہی ہیں۔ غزنی، کابل، قندھار اور گردیز

— آج بھی ہمارا وہی دشمن ہے مگر ہمیں اس کی محبت کے سلیس دینے جارہے ہیں اور سلطان محمود غزنوی کا مقبرہ ایک بے دین قوم کے شکنگوں اور پیاروں کی گرج سے لزر رہا ہے۔

ہمارے حصے میں سلطان محمود کے سرہ حملے آئے۔ باقی تمام داستان بخت پرستوں کی دھرتی کی سٹی میں دب گئی ہے۔ ایک عظیم روایت کو سرہ چلے کا نام دے کر اسے حریت سے خالی کر دیا گیا ہے۔ ہمارے تاریخ کو ہندو نے دس لیا ہے۔ حق کے اس پیامبر اور بخت شکن کی زندگی کا ہر ایک لمحہ ہماری تاریخ ہے۔ اس تاریخ کی روح زندہ ہے، اسے زندہ کرنا ہے۔

۱۰۲۰-۱۰۲۱ عیسوی (۴۱۲ ہجری) کے موسم سرما کا آغاز تھا جب غزنی کی فوج سیلاب کی طرح غزنی سے ہندوستان کو آ رہی تھی۔ سیلاب سے مراد یہ نہیں کہ وہ کوئی بہت بڑا لشکر تھا۔ وہ اُس لشکر کے نصف سے بھی کم تھی جو گنگا جنا کے مدد آ رہے تھے۔ اُس کے مقابلے اور اُسے ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کے لیے جمع ہو رہا تھا۔ تمام مورخ متفق ہیں کہ اب کے ہندو ہمارا جوں نے جو متحدہ فوج اکٹھی کی تھی، اُس کی نفرت یہ تھی۔ ایک لاکھ چالیس ہزار سپاہ۔ چھتیس ہزار گھوڑ سوار اور چھ سو چالیس جنگی ہاتھی۔ اُس دھڑ کا ایک مورخ فرخ تھیا۔ جس نے ہندو کی جنگی طاقت پر لکھی ہے۔ ایک لاکھ پچاس ہزار سپاہ چھتیس ہزار گھوڑ سوار اور نو سو جنگی ہاتھی۔

اگر ہم ان دونوں میں سے کسی کو بھی صحیح مان لیں تو بھی یہ حقیقت قائم رہتی ہے کہ سلطان محمود فوج لے کے آ رہا تھا، اس کی تعداد اس سے نصف تھی۔ اس کے علاوہ سلطان محمود کی سب سے زیادہ خطرناک کمزوری یہ تھی کہ وہ اپنے وطن سے ہزاروں میل دور دشمن کے ایسے علاقے میں لڑنے کے لیے آ رہا تھا جو دشمنوں سے گھرا ہوا تھا۔ وہاں کے پیر پودے اور وہاں کے پتھر بھی اُس کے دشمن تھے۔

آج مینارِ پاکستان کھڑا ہے، وہاں نوصدیاں پہلے جنگل جھوٹا کر رہا تھا۔ اس جنگل میں لاہور کے ہمارے جوں نے مسلمان لڑکیوں کی انسانی قربانیاں دی تھیں۔ ان کے خون سے اپنے پتھر کے دیوتاؤں کے پاؤں دھوئے تھے۔ اکی لاہور میں جسے اندر دین لاہور کہتے ہیں، مسلمان نوجوانوں نے غزنی کے جاسوسوں کو چھپا کے رکھا اور ان کی مدد اور رہنمائی کی تھی۔ ان جاسوسوں کو بچانے کے لیے مسلمان عورتوں نے اپنی جانیں اور عصمتیں لڑا دی تھیں۔ وہ تید خانے میں کمیں جھوٹا کرتے تھے جن میں مسلمانوں کو اذیتیں دے دے کر ختم کیا جاتا تھا۔

مٹان کے ریگستان کو جس کی فضا میں محمد بن قاسم کے کہا بدوں کے نعرے آج بھی ایک مقدس اور دلولہ انگیز گونج بن کر بھنگ رہے ہیں، غزنی کے شیروں نے اس ریت کو اپنے ٹھوسے سیراب کیا تھا۔ وہ مٹان کی ٹھکیوں میں لڑے تھے۔ وہ جھلٹے اور جھلٹاتے ریگستانوں میں لڑے تھے۔

سلطان محمود غزنوی باطل کی جنگی طاقت پر جس نعرے کو مانتا تھا، سب مورخ اس کی گواہی دیتے ہیں۔ مٹان اسلام کے نام پر قرامطی نام کے ایک باطل عقیدے کا مرکز بن گیا تھا۔ قرامطیوں کی فوج اور غیر فوجی قرامطی غزنی کی حق پرست فوج کے آگے چٹانوں کی طرح کھڑے ہو گئے تھے۔ ان چٹانوں کو ریزہ ریزہ کرنے کے لیے سلطان محمود سپاہیوں کی طرح لڑا تھا۔ مٹان کی گلیوں میں بھی لڑائی ہوئی تھی۔ مورخ کہتے ہیں کہ سلطان محمود نے اس قدر تلوار چلائی تھی کہ اُس کا دایاں ہاتھ تلوار کے دستے پر اکڑ گیا تھا اور اس پر دشمن کا اس قدر خون جم گیا تھا کہ لڑائی کے بعد اُس کی انگلیاں دستے سے اکھڑتی نہیں تھیں۔ تلوار اس کے بازو کا حصہ بن گئی تھی بہت دیر تک اُس کے ہاتھ پر گرم پانی ڈالتے رہے تھے تو ہاتھ کھلا اور تلوار سے الگ ہوا تھا۔ یہ وہ قہر تھا جو دشمن کی نفرت سے پیدا ہوا کرتا ہے

لمحے کے بعد ہی اُس کی موت آسکتی ہے۔ اُس کے کان بند ہو جاتے ہیں کسی کی فریاد وہ سُن نہیں سکتا۔ اُس کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ وہ دیکھ نہیں سکتا کہ اُس کی رعایا بھوک اور تشنگی ہے۔ اُسے وہی نظر آتا ہے جو اُسے اُس کے درباری دکھاتے ہیں، اور درباری اُسے وہی دکھاتے ہیں جس میں اُن کا اپنا مفاد ہوتا ہے۔“

سلطان محمود سر جھکا کر اُسے کھڑا کر رہا تھا۔

”میں آپ کو زیادہ دیر نہیں روکوں گا محمود!۔ ابو سعید عبدالملک کہہ رہے تھے۔“ یہ نہ بھولنا کہ تمام دنیا اُسے کھڑکی نظریں آپ پر لگی ہوئی ہیں۔ سب آپ کی موت کے منتظر ہیں۔ آپ کے پڑوسی جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، وہ بھی آپ کی موت کے خواہش مند ہیں۔ عہد کرلیں کہ آپ مر جائیں تو بھی زندہ رہیں۔ اپنی قوم کے دل میں اور تاریخ میں زندہ رہیں۔ آنے والی نسلیں آپ کو ایک روایت بنا کر زندہ رکھیں۔ اگر آپ نے ہندوستان کے بہت پرستوں کا سہرہ بچلا تو وہ اُس وقت تک مسلمانوں کا سر کھیتے رہیں گے جب تک کہ وہاں ایک بھی مسلمان باقی ہے۔“

”وہاں کریں اللہ تجھے کامیابی عطا فرمائے۔“ سلطان محمود نے کہا۔ اب میں وہاں اپنی باقاعدہ حکومت قائم کر کے لوٹوں گا۔ وہاں اپنا ہیرو اور کافی فوج بھی رکھوں گا۔“

”الوداع محمود! ابو سعید نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ اللہ آپ کا مسافر اور مددگار ہو۔“

سلطان محمود نے اُن کا ہاتھ چومنا اور گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

سلطان محمود جانتا تھا کہ دشمن اُس کے آگے بھی ~~نکلے~~ نہیں بھیجے۔ آگے ہند اور نیچے مسلمان، مگر اُسے معلوم نہیں تھا کہ اب دشمن اُس کے ساتھ بھی جا رہا ہے۔ یہ سلجوتی تھے جو سلطان محمود کی اطاعت قبول کر کے

ہندوستان کی ریاست کنوج کا مہاراجہ راجپال قتل ہو گیا تھا۔ اس کی اطلاع ملتے ہی سلطان محمود نے فوج کو کنوج کا حکم دے دیا تھا۔ غزنی کی فوج کے لیے ایک ہندوستانی مہاراجہ کا قتل کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا لیکن راجپال سلطان محمود کے لیے اس لیے اہم تھا کہ وہ غزنی کا اتحادی بن گیا تھا۔ اس کا قتل سلطان کے لیے بڑا داغِ اشارہ تھا کہ ہندوستان کے مہاراجے متحدہ ہو گئے ہیں اور ان کا دم ختم ابھی ٹوٹا نہیں۔ فوج کے قلعہ دار سالار ابو القدر سلجوتی نے راجپال کے قتل کے پیغام کے ساتھ ہندوستان کے مہاراجوں کی سرگرمیوں کی اطلاع بھی دے دی تھی۔

شیخ ابوالکس فرغانی کے علاوہ سلطان محمود ایک اور عالم ابو سعید عبدالملک بن عثمان کا بھی متحدہ تھا۔ یہ عالم غزنی سے بہت دور رہتے تھے۔ سلطان کبھی کبھار اُن سے ملنے اتنی لمبی مسافت طے کر کے جایا کرتا تھا۔ اب اُس نے ہندوستان کو کنوج کیا تو دوبارے بڑا دکھ اٹھنے لگا۔ فوج جا رہی تھی، آگے سے ایک سالار سر پٹ گھوڑا دوڑاتا فوج کے وسط میں آیا جہاں سلطان محمود تھا۔ اُس نے سلطان کو بتایا کہ ابو سعید عبدالملک راستے میں کھڑے ہیں۔ سلطان نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور وہاں پہنچا جہاں ابو سعید کھڑے تھے۔ سلطان گھوڑے سے کود کر اُترا اور ابو سعید کے گھٹنے چھو کر مصافحہ کیا۔

”مجھے کل بتہ چلا ہے کہ آپ ہندوستان جا رہے ہیں۔“

ابو سعید عبدالملک نے کہا۔ ”اللہ آپ کے ساتھ ہے جنگی امور اور رموز کو آپ سمجھتے ہیں، میں کوئی ہندو نصیحت نہیں کر سکتا۔ انسان ہی کہوں گا کہ آپ تاریخ لکھنے جا رہے ہیں جو ہماری آنے والی نسلیں کے لیے شعل راہ ہوگی۔ اس جنگ کو اپنی ذاتی جنگ نہ سمجھنا اور یاد رکھنا کہ مہاراجہ بادشاہی التکلی ہے۔ تحت و تاج کا لشکر دل و دماغ سے اتار دینا۔ یہ ایسا لشکر ہے جسے چٹھہ بنانے وہ رین کو بھول کر دینا کاہور مہتا ہے اور بھول جاتا ہے کہ ایک

اُس کی فوج میں شامل ہو گئے تھے۔ سلجوقی جنگجو تھے۔ یہ غسر قبیلے کے لوگ تھے جو اپنے سردار لقمان سلجوقی کے ساتھ اس قبیلے سے الگ ہو گئے اور اپنے آپ کو سلجوقی کہلانے لگے تھے۔ وہ بخارا کے پہاڑی علاقے میں آباد ہو گئے۔ اُنہوں نے ترکستانوں اور سمانیوں کی لڑائیوں میں سمانیوں کا ساتھ دیا، بلکہ سمانی اُن کے بل بوتے پر لڑا کرتے تھے۔ اس طرح وہ ایک جنگی طاقت بنتے گئے۔

لقمان سلجوق کے بیٹے اسرائیل سلجوق نے بخارا میں خاصا اثر و سوج حاصل کر لیا۔ اُس نے ایک حکمران البیگین کی بہت مدد کی۔ اسرائیل اور البیگین کی گہری دوستی ہو گئی، سلطان محمود نے اپنے ان دشمنوں کو کچلنے کے لیے حملہ کیا تو دونوں بخارا کے پہاڑی علاقوں میں بھاگ گئے تھے۔

ایک خان ایک طاقتور حکمران تھا۔ وہ کسی نہ کسی کو ساتھ ملا کر سلطان محمود کے ساتھ بہت لڑا تھا مگر اُس نے ہر بار شکست کھائی۔ آخری شکست کے بعد جب وہ اپنے خاندان کے ساتھ کسی خوشنما پہاڑی علاقے میں چھپا ہوا تھا تو اسرائیل اسے پکڑ گیا۔ اس لڑائی میں اسرائیل کے سلجوقی ایک خان کے ساتھ نہیں تھے، اسرائیل اُسے تلاش کرتا اُس تک پہنچ گیا ایک توقدرت نے اُس جنگ کو اپنا حُسن دے رکھا تھا، دوسرے ایک خان کی خیمہ گاہ نے دہان محل جیسی دہائی بنا رکھی تھی۔ وہ اپنی دنیا کا بادشاہ تھا۔ اپنی بادشاہی کو وہ سلطنتِ غزنی تک پھیلانے کے لیے لڑ رہا تھا مگر شکست کھا گیا۔

اُس کی خیمہ گاہ میں عورتیں بھی تھیں۔ ناچنے گانے والیاں بھی تھیں اور محل کے تمام تر لوازمات اور شان و شوکت وہاں موجود تھی۔ اسرائیل جب وہاں گیا تو ایک خان اُسے اپنے خیمے میں بلا یہ خیمہ محل کے کمرے جیسا خوشنما اور کٹاں تھا۔ اسرائیل کو وہ جاتا تھا۔ اسرائیل خیمہ جو ان تھا۔ خبر دے گا۔ اُس کی آنکھیں بنز تھیں اور وہ سلجوقیوں کا سردار

تھا اور سلجوقی ایک جنگی طاقت تھے۔
”اب میرے پاس کیوں آئے ہو؟“ ایک خان نے اُس سے پوچھا۔

”یہ دیکھنے کے لیے کہ میدانِ جنگ سے بھاگے ہوئے سردار کی حالت کیسی ہوتی ہے۔“ اسرائیل نے طنز یہ کہا۔ ”آپ کو مجھ سے یہ گلہ ہے کہ میں آپ کی مدد کو نہیں آیا، اور مجھے یہ شکایت ہے کہ آپ نے مجھے مدد کے لیے بلایا نہیں۔ کیا آپ اپنے آپ کو اتنا طاقتور سمجھ بیٹھے تھے کہ میرے بغیر غزنی کے محمود کو شکست دے سکیں گے؟“

”تمہیں خود آنا چاہیے تھا۔“ ایک خان نے کہا۔
”نہیں۔“ اسرائیل بولا۔ ”آپ محمود کو شکست دے کر خود غزنی اور بخارا کے بادشاہ بننے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ سمانی میرے قبیلے کی مدد کے بغیر ترکستانوں کو شکست نہیں دے سکتے تھے۔ سمانی اُس وقت ختم ہوئے جب سلجوقیوں نے اُن کا ساتھ چھوڑ دیا۔ ترکستان آج بھی ہم سے دُرتے ہیں۔“

”کیا تم مجھے طعنے دیتے آئے ہو؟“ ایک خان نے کہا۔ ”کیا تم یہ دیکھنے آئے ہو کہ میں کتنا کمزور ہو گیا ہوں؟“
”نہیں ایک خان!“ اسرائیل نے کہا۔ ”شکست کا اتنا اثر قبول نہ کرو کہ دوست اور دشمن کو بھی پہچان نہ سکو۔ ہم دونوں کا دشمن ایک ہے۔ غزنی کا سلطان محمود۔۔۔ آپ اکیلے اُسے شکست نہ دے سکتے۔ میں اکیلا اپنے سلجوقیوں کے ساتھ اُسے شکست دے سکتا ہوں اور دوں گا۔ میں یہ دیکھنے آیا ہوں کہ آپ میری کیا مدد کر سکتے ہیں۔ کیا مجھے کچھ فوج دے سکتے ہیں؟ اگر نہ دے سکیں تو بھی میں سلطان محمود سے لڑوں گا۔ البیگین میرے ساتھ ہے۔“

”ہوش کی بات کرو اسرائیل!“ ایک خان نے کہا۔ ”تم نے دوسروں

کا جو محو کی فوج میں ہیں۔“

شراب کا دوسرا چل رہا تھا۔ شراب بڑی خوبصورت عورتیں پیش کر رہی تھیں۔ ایک خان کے پاس میں چار جوان لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ وہ بخارا کے تدرتی خن کا شاہکار تھیں۔ اسرائیل ان سے زیادہ نہیں تو انہی جیسا خوب تھا اور مردانہ جاہ و جلال کا بڑا خوبصورت اور مضبوط جسم۔

”میں اپنے آپ کو غزنی کے تخت پر بیٹھا ہوا دیکھا کرتا ہوں۔“ اسرائیل سلجوتی نے شراب کا جام لہرا کر کہا۔ اس میں شراب کا نشہ بھی تھا۔ طاقت کا بھی۔

ایک خان نے اُسے دو چار روز کے لیے روک لیا۔

رات چاندنی اور فضا میں پھولوں کی بھنی بھنی مہک تھی۔ اسرائیل اپنے خیمے سے دور ٹہل رہا تھا۔ اُس نے محسوس کیا کہ وہ اکیلا نہیں۔ اُس نے اپنے خیمے پر ہاتھ رکھا اور رک کر ادھر ادھر دیکھا۔ ایک سایہ درختوں کی چھاؤں میں سے بڑھا آ رہا تھا۔ سایہ مرد کا نہیں تھا۔

”کون؟“

”مریم۔“ چاندنی میں آکر یہ سایہ نسوانی حسن کا متحرک مجسم بن گیا۔ اُس نے کہا۔ ”ایک خان کی بیٹی ہوں۔“

اسرائیل نے اُسے قریب ہو کر غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کل تم ہیں ایک خان کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔۔۔ یہاں کیوں آئی ہو؟“

”یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے؟“ مریم نے کہا۔ ”لیکن اس سے پہلے کہ آپ کچھ اور سمجھ لیں، میں آپ کو بتا دوں کہ میں آپ کی وجاہت اور مردانہ حسن اور جسم سے متاثر ہو کر نہیں آئی۔ مجھے آپ کے عزم نے متاثر کیا ہے۔ خیال رکھیں، میں کنواری ہوں اور میں ایک خانیوں کی عزت ہوں مگر یہ عزت مجھے خطرے میں نظر آ رہی ہے۔ چچا ایک خان

کو مدد دی ہے اور مدد کے انداز سے لڑے ہو۔ ہمارا آسنا سنا محمود کی فوج سے نہیں ہوا۔ محمود اپنی جنگی چالوں سے اپنے سے دگنی اور طاقتور فوج کو کبھی شکست دے دیا کرتا ہے۔ اُس کی فوج بے لگام ہو کر نہیں بلکہ سیدھے ہوئے گھوڑوں کی طرح لڑتی ہے۔ اشاروں پر حرکت کرتی ہے۔ ہم میں وہ بات نہیں۔“

”ایک خان! اسرائیل نے کہا۔ اس شکست نے آپ کے سراغ پر گہرا اثر کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مجھے آپ سے مدد لینا بھی نہیں چاہیے۔ اگر خان پر یہ دہشت سوار ہے تو خان کے پاسی تو کانپ رہے ہوں گے مجھے سلطان محمود سے لڑنا ہے۔ وہ بہت بڑی طاقت فٹا جا رہا ہے۔ ہندوستان کی دولت نے اُسے بہت زیادہ طاقتور بنا دیا ہے اور وہ دن دور نہیں جب بلخ، بخارا، سمرقند، ترکستان اور خوارزم سلطنت غزنی کے غلام ہوں گے اور ہم بحر میں کی طرح دور کہیں پہاڑیوں میں بھاگے بھاگے پھریں گے۔“

”سنا ہے کچھ سلجوتی بھی اُس کی فوج میں شامل ہو گئے ہیں۔“

ایک خان نے کہا۔

”اُس نے ہندوستان کے زرد جواہرات سے ان سلجوتیوں کو فریاد ہے۔ اسرائیل نے کہا۔ اُس کا ایک سالار بھی سلجوتی ہے۔ ابوالقدح سلجوتی۔“

”ہندوستان میں کہیں قلعہ دار ہے؟“

”کیا تم ان لوگوں کو واپس اپنے قبیلے میں نہیں لاسکتے؟“ ایک خان نے پوچھا۔

”یوں کہو ایک خان! کیا تم ان لوگوں کے ہاتھوں سلطان محمود کو نہیں

مردا سکتے؟“ اسرائیل نے کہا۔ ”لالی صرف میدان میں نہیں لڑی جاتی خان محترم! میں محمود کو اُس کے سالار ابوالقدح سلجوتی سے مرداؤں گا، لیکن ایک بار میدان میں لڑوں گا۔ اگر میں مار گیا تو ان سلجوتیوں کو استعمال کروں

”مریم!“ وہ واپس آئی تو عزیزین نے اُسے کہا ”تمہارا انتخاب اس سے بہتر نہیں ہو سکتا تھا۔ تمہارا خاندان اسرائیل ہی ہونا چاہئے، مگر مریم! اسرائیل کے ساتھ شادی کر کے تم سلطان محمود کے ساتھ دشمنی بنی کر رہی۔ کیا تم نے سنا نہیں کہ چچا ایک کڑ رہے تھے کہ وہ اپنے خاندان کی بیٹیاں محمود کے خاندان میں دے کر اُس کے ساتھ صلح کر لیں گے؟“

”یہ ان کی شکست کی دلیل ہے۔“ مریم نے کہا۔ ”وہ سلطان محمود سے اس قدر خوفزدہ ہیں کہ اپنی بیٹیاں تک دینے کو تیار ہو گئے ہیں۔ اسرائیل سلطان محمود کے ساتھ کسی قیمت پر صلح نہیں کرے گا۔“

”اور شکست کھانے گا۔“ عزیزین نے جھنجھلا کر کہا۔ ”اُس کا انجام وہی ہو گا جو چچا ایک خان کا ہو رہا ہے، جو سلطان محمود کے ہاتھوں قادی خان کا ہوا تھا، جو خوارزم شاہی کا ہوا اور جو قراہیوں کا ہوا ہے۔“

”اسرائیل ان سب کا انتقام لے گا۔“ مریم نے فخر سے کہا۔ ”عزیزین! تم ایسی باتیں کیوں کیا کرتی ہو جن سے غزنی والوں کی غلامی اور شکست کی بُرائی ہے؟“

”غزنی والوں کی غلامی نہیں اسلام کی غلامی کہو۔“ عزیزین نے کہا۔ ”تم دنیا کی باتیں کرتی ہو، میں اُس دنیا کی باتیں کر رہی ہوں جس میں تمہیں مرکز جانا ہے۔ آپس میں لڑ کر ہم نے کیا پایا ہے؟ ہم نے وہ طاقت ضائع کر دی ہے جو اسلام کے دشمنوں کے خلاف استعمال ہونی چاہئے تھی۔ اگر ہم سب نے مل جل کر سلطان محمود کو شکست دے دی تو کامیاب ہم نہیں بلکہ اسلام کے دشمن ہوں گے۔“

مریم ہنس پڑی۔ اُس کی ہنسی میں طنز تھی۔ اُس نے کہا ”تم اسلام اسلام کی رُٹ دکھاتی رہ جاؤ گی اور میں سلطنت غزنی کی حکمہ ہوں گی۔ تم کسی بڑے سلاار کی بیوی بنو گی.... لیکن نہیں میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ میں تمہاری شادی کسی تم جیسے خوبصورت مرد کے ساتھ کرواؤں گی جس کے پاس دولت بھی

دل چھوڑ بیٹھے ہیں۔ یہ میری غیرت کو گوارا نہیں۔ کیا غزنی کا سلطان محمود جن ہے؟ بھوت ہے؟ دیو ہے؟ میں اُس مرد پر اپنا سب کچھ قربان کر دوں گی جو محمود کی سلطنت کو تباہ کر کے اسے بھٹکنے کے لیے ان پہاڑوں میں چھوڑ دے گا؟“

اسرائیل ہنس پڑا اور بولا ”شہزادی کو محمود کے ساتھ کیا دشمنی ہے؟“ اسرائیل سلجھتی ہوئی کو محمود سے کیا دشمنی ہے؟“ مریم نے کہا۔

”ادھر آئیے۔ بیٹھ کے باتیں کریں.... دشمن دشمن ہوتا ہے۔ کیا اور کیوں کا فیصلہ دشمن کو شکست دے کر کیا جاتا ہے۔“

”مریم!“ اسرائیل نے کہا۔ ”تمہارا جسم کنوارہ ہے۔ تمہارا دماغ کنوارہ نہیں لگتا۔ تم نے بڑی پختہ بات کی ہے۔“

وہ دہشتوں کے پتے چاکے بیٹھ گئے اور تھوڑی ہی دیر بعد اُن کے ہاتھ ایک دوسرے کے ہاتھوں میں الجھ گئے، پھر وہ ایک سایہ بن گئے اور اسرائیل نے سرگوشی کی۔ ”ایک خان سے بات کروں؟“

”وہ نہ مانے تو میں خود آ جاؤں گی۔“ مریم کی سرگوشی سنائی دی۔

”میں ہمیشہ کے لیے تمہاری بیوی اسرائیل! میں ایسے ہی ایک مرد کے انتظار میں تھی جس کے ارادوں کو میرا عزم گلے لگا سکے۔ سلطان محمود کو ختم کرنے کے لیے مجھے جس طرح بھی استعمال کرنا چاہو گے مجھے تیار۔ پاؤ گے۔“

وہ چلی گئی۔

اسرائیل دہائی تین راتیں رہا۔ تینوں راتیں مریم اُسے وہاں ملی جہاں پہلی رات ملی تھی۔ آخری رات اُس کے خاندان کی ایک اور شہزادی عزیزین بھی جو اُس کی بہن تھی، اُس کے ساتھ تھی۔ مریم اسرائیل کے پاس گئی تو عزیزین دودھ کھڑی رہی تھی۔ پھر اسرائیل چلا گیا۔

ہوگی اور جس کا حکم چلے گا۔

”اور اسرائیل سلجوتی بادشاہ ہوگا۔“ غنبرین نے طنزیہ کہا۔

”اے“ مریم بولی ”وہ ہے ہی بادشاہ۔ اسے وہ تخت و تاج چاہیے جس پر سلطان محمود بیٹھا ہے۔“

”تم خواب دیکھ رہی ہو مریم!“

”تم ٹھیک کہتی ہو۔“ مریم نے کہا۔ ”میں خواب دیکھ رہی ہوں۔ اسرائیل میرے خوابوں کی تعبیر بن کے آیا ہے۔ میں یہ خواب بچپن سے دیکھ رہی ہوں۔ مجھے ملکہ بننا ہے۔ سر ہر تاج رکھنے کے لیے میں اپنا سب کچھ قربان کر دوں گی۔“

”ہاں اسرائیل!“ ایک خان نے اسرائیل کی درخواست سن کر کہا۔ ”مریم کے باپ نے مجھے اجازت دے دی ہے کہ میں مریم کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دے دوں لیکن وعدہ کرو کہ تم سلطان محمود سے میری شکست کا انتقام لوگے۔ مجھے عمر نے اور اپنے دوستوں نے دھوکا دیا ہے۔ میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ دوستوں نے میدان جنگ میں ہی ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ میں نے تو سوچا تھا کہ سلطان محمود کے ساتھ رشتے ناٹے جو درباری غلام سے سزا دوں گا لیکن تم امید کی ایک کرن بن کر آئے ہو۔ تم میری خواہش پوری کر سکو گے۔“ مریم کے ساتھ مجھے بہت پیار ہے۔ اگر کہا کرتی ہے کہ وہ ملکہ بننے کے لیے پیدا ہوئی ہے۔ تم اسے ملکہ بنا سکتے ہو۔“

”میں آپ کی یہ خواہش کہ سلطان محمود کو شکست دی جائے اور مریم کی یہ خواہش کہ وہ ملکہ بنے پوری کر دوں گا۔“ اسرائیل نے کہا۔ ”میں ابھی سلطان محمود کے آسنے سے نہیں آیا۔ اگر میں پہلی بار اس کے سامنے جم نہ سکتا تو مجھے ہٹ آؤں گا۔ دوسری بار بھی اسے شکست نہ دے سکتا تو میں دوسرا عہدہ استعمال کروں گا۔ آپ مطمئن رہیں۔ محمود آپ کی زندگی میں ختم

ہوگا۔ اُسے میرے ہاتھوں ختم ہونا ہے۔“

اسرائیل سلجوتی نے پُر غزم باتوں سے ایک خان کے دل سے شکست کی جھوٹ سیلا دی اور وہ مریم کو دلہن بنا کے لے گیا۔ اس کے قبیلے کو پہلے اطلاع مل چکی تھی کہ وہ دلہن لا رہا ہے اور دلہن کوئی عام قسم کی قبائلی لڑکی نہیں بلکہ ایک خان جیسے بڑے کی بہتی ہے۔ ایک خان کو شکست خوردہ تھا لیکن اُن دنوں سلطان محمود کے خلاف لڑنا بہت بڑا امر سمجھا جاتا تھا۔ سلطان محمود کو کوئی دل گروے والا ہی ٹھکارا لگتا تھا۔ اس لحاظ سے ایک خان کی بڑی دھوم تھی۔

سلجوتی ہزاروں کی تعداد میں اکٹھے ہو گئے تھے۔ بکرے اور اونٹ اپنے زیادہ ذبح ہونے کر کھانوں کی پیناڑی بن گئی اور خون ندی کی طرح بہنے لگا۔ ساری رات جشن منایا گیا۔ دوسرے دن اسرائیل نے تمام قبیلے کو ایک جگہ اکٹھا کیا اور مریم کے ساتھ بلند جگہ کھڑے ہو کر قبیلے سے خطاب کیا:

”آج میں تمہیں وہ ملکہ دے رہا ہوں جو محمود کی سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجانے کا عہدہ کر کے آئی ہے۔ ملکہ مریم جتنی حسین ہے اتنی ہی غزم اور عہدہ کی کٹی ہے۔ سلجوتی شیر و اکیا تہا رسی تواریں غزنی والوں کے خون کی سیاسی نہیں! قبیلے نے اسے گرجدار غرے لگائے کہ پیار کا پتہ لگے۔ ہندوستان کا لیڈر آج ہمیں آنکھیں دکھا رہا ہے۔ عہدہ کرو کہ محمود کو ہیش کی غیند سلا کر سوئیں گے۔ اب ہماری منزل غزنی ہوگی۔ مت بھولو کہ ہمارا کوئی ملک نہیں۔ زمین کا کوئی ایسا ٹکڑا نہیں جسے سلجوتی اپنا وطن کہہ سکیں۔ ہم جنگی جانوروں کی طرح پہاڑوں اور وادیوں میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ ہم کمزور نہیں۔ ہم ایک طاقت ہیں۔ ہم ایک فوج ہیں۔ ہم ایک قوم ہیں۔ ہماری طاقت دوسرے استعمال کر رہے ہیں۔ ہم بکھرنا شروع ہو گئے ہیں۔ کئی سلجوتی غزنی کی فوج میں شامل ہو گئے ہیں۔ سلطان محمود نے انہیں ہندوستان سے لوٹی ہوئی دولت سے فریاد لیا ہے۔ وہ اسلام کے نام پر سب کو دھوکہ دے رہا ہے۔ اسلام

کے پاس ان ہم ہیں لیکن ہم پہلے سلجوتی، اس کے بعد مسلمان ہیں۔ محمد اسلام کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ وہ اپنے آپ کو بت لیکن کہلاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُس نے اپنے آپ کو ایک بت بنا لیا ہے اور ہم سب سے پہلے آگے بڑھ کر، چاہتا ہے۔ ہم خدا کے سوا کسی کے آگے نہیں ٹھیکیں گے۔ تلواریں نیز کرلو۔ نیکشیں تیروں سے بھر لو۔ نیار ہو جاؤ۔ ہمارا اگلا جشن فتح کا جشن ہو گا۔

اُسی روز پہاڑی علاقے میں گھاگھسی شروع ہو گئی۔ پھینکنے والی برجھیاں تید ہونے لگیں۔ گمانیں اور تیر تید ہونے لگی۔ وہ وہ دُور سے سلجوتیوں کو اٹھنا کیا جانے لگا۔ اور ایک جہینے کے قلیل عرصے میں ایک لشکر تیار ہو گیا۔ ہر ٹیل سلجوتی نے ایک خان کی بھی کچھ فوج لے لی اور اس فوج کے ساتھ ایک خان کا بیٹا احمد توغان خان کا مذہب کا آیا۔

غزنی کی فوج میں ارباب خان سلجوتی ایک جیش کا عہدہ دار تھا۔ ایک روز اُس کا باپ اُسے ملے آیا۔ ملے کا مقصد صرف باپ بیٹے کی ملاقات نہیں تھی، بلکہ باپ بیٹے بیٹے کو بتانے آیا تھا کہ سلجوتی سلطان محمود کے خلاف لڑنے کی تیاریاں کر رہے ہیں اور سلجوتی درویشوں نے فتویٰ دیا ہے کہ جو سلجوتی غزنی کی فوج میں ہیں وہ واپس اپنے قبیلے میں آجائیں، ورنہ وہ کافروں کی موت مرید گے اور ان کی لاشیں گدیہ اور کتے کھائیں گے۔ ارباب خان نے اپنے باپ سے سلجوتیوں کی تیاریوں کی کھنسی سُنی اور باہر نکل گیا۔ وہ اپنے سلاہ کے پاس گیا اور اُسے بتایا کہ سلجوتی غزنی پر حملے کی تیاریاں کر رہے ہیں اور یہ اطلاع سلطان تک پہنچی چاہیئے۔

محمود کی دیر بعد باپ بیٹا سلطان محمود کے سامنے کھڑے تھے۔

”میں تمہارے بیٹے کی قدر کرتا ہوں کہ اس نے اپنے باپ کو مجرم بنا کر اپنے سلطان کے سامنے کھڑا کر دیا ہے۔“ سلطان محمود نے کہا۔ ”میں اسے کیا انعام دوں گا، اسے اصل انعام خدا دے گا۔“

بوڑھا خوف سے کانپنے لگا۔ اُسے بڑی ہی خوفناک سزا نظر آنے لگی تھی۔

”جے روشنی نہ دکھائی گئی ہو اُس پر کوئی الزام نہیں کہ وہ راستے سے ہٹ گیا ہے۔“ سلطان محمود نے کہا۔ ”اب تمہارا بیٹا تمہیں روشنی میں لے آیا ہے۔ مجھے بتاؤ کہ سلجوتی کیسی تیاریاں کر رہے ہیں اور ان کے ارادے کیا ہیں۔“ نہیں بتاؤ گے تو میں بننے بننے قید نہیں کروں گا۔ تم ہمارے بھان ہو اور مسلمان ہو۔ عزت سے رخصت کروں گا مگر تم جان سکو کہ سچا اسلام کہاں ہے اور خدا کس کے ساتھ ہے۔ کیا تم خدا سے ٹکر لے سکتے ہو؟“

بیٹا بھڑک اٹھا اور بولا ”گستاخی کی سعائی چاہتا ہوں سلطان عالی مقام! اگر میرے باپ نے سچ نہ بولا تو میں یہیں اس کا سر کاٹ کر آپ کے قدموں میں رکھ دوں گا۔“

”تم نے گستاخی میری نہیں کی، اپنے باپ کی کی ہے۔“ سلطان محمود نے مہر کر کہا۔ ”اس نے صرف ایک مُرخ دیکھا ہے۔ اسے دو سمرانج بھی دیکھئے دو۔“

بوڑھا اتنا متاثر ہوا کہ آگے بڑھ کر سلطان محمود کے آگے دوڑا ہوا گیا۔ اُس نے اپنی کمر سے تلوار اتار کر سلطان کے قدموں میں رکھ دی اور اُس نے بتانا شروع کر دیا کہ ان کے سردار اسرائیل نے ایک خان کی بیٹی کے ساتھ شادی کر لی ہے اور ایک خان کی کچھ فوج کو اپنے ساتھ ملا کر غزنی پر حملے کی تیاری کر رہا ہے۔ سلطان محمود نے اُس سے اپنے مطلب کی بہت سی باتیں پوچھیں اور حکم دیا کہ اس بوڑھے کو شاہی بھان کی حیثیت سے رکھا جائے۔ اسے بھیج کر سلطان نے ارباب خان سلجوتی کو کچھ انعام دیا اور اُسے کہا کہ وہ اپنے قبیلے میں اسرائیل کا وفادار بن کر چلا جائے اور وہاں کے حالات دیکھ کر چوری چھپے واپس آجائے۔

ارباب خان پندرہ سولہ دنوں بعد آگیا اور اُس نے سلطان محمود کو

سلجوقیوں کی تمام ترجیحی معلومات دے دیں سلطان محمود کی فوج میں دیکھا مگر سلجوقی تھے۔ ان کے نائب سالار نے ان کی وفاداری کی بہت تعریف کی سلطان نے دونوں سے کہا کہ وہ اسرائیل سلجوقی کے پاس چلے جائیں اور اُس کی رہنمائی کرتے ہوئے لائبہ سلطان نے بہت سی ہدایات دے دیں اور اپنے سالاروں کو بلا کر فوج کو بخارا کے پہاڑی علاقے کی سمت کوچ کا حکم دے دیا۔

۱۸-۱۰۷۱ء کا واقعہ ہے۔ سلجوقی لشکر نے ترمز کے مقام سے دریائے اوس عبور کیا۔ یہ جنگوں کا لشکر تھا اور اپنے آگے سب کچھ بہا لے جانے والے سیلاب کی طرح آ رہا تھا۔ یہ چونکہ قبائلی لوگ تھے، ان کی کوئی باقاعدہ بادشاہی نہیں تھی، اس لیے وہ راستے میں آنے والی بستیوں کو ٹوٹے آرہے تھے۔ انہوں نے کھڑے نفس اپنے مویشیوں کو کھلا دیئے۔

*

اسی جگہ جہاں اسرائیل نے اپنے قبیلے سے ملا کر کہا تھا کہ تو ابیں تیز کر لو، بزکشیں تیروں سے بھرو، ہمارا اگلا جشن فوج کا جشن ہوگا، وہیں اسرائیل اپنے بچے میں لپٹا ہوا تھا۔ مریم نے اپنے ہاتھوں اُسے شراب کا جام پلایا تھا۔ ان کے پاس ایک درویش صورت آدمی بیٹھا تھا۔

”پہلی شکست آخری شکست نہیں ہوا کرتی“۔ درویش کہہ رہا تھا۔
”ول برداشتہ نہ ہو اسرائیل! تم بے خبری میں مارے ہو۔ آخر فتح متاری ہوگی۔“ اسرائیل رخ خاموشی طاری تھی۔ وہ جیسے کچھ سن ہی نہیں رہا تھا۔ مریم نے درویش کو اشارہ کیا تو وہ جیسے نکل گیا۔ مریم نے اسرائیل پر اپنے سن دجری کا جادو طاری کرنا شروع کر دیا اور اُسے وہ عہد یاد دلایا جو اس نے پہلی ملاقات میں کیا تھا۔ اسرائیل کے جسم میں لالہ والیس اپنے لگی۔

تین چار روز بعد جب اسرائیل اپنے قبیلے کو از سر نو منظم کر رہا تھا، اُسے اطلاع ملی کہ ایک خان مر گیا ہے اور اُس نے مرتے وقت کہا ہے کہ اسرائیل سے کہنا کہ تم نے وعدہ کیا تھا کہ میری زندگی میں تم سلطان محمود کو ختم کر دو گے لیکن متاری پسالی کی تفصیل سن کر مجھے اتنا صدمہ ہوا ہے جو میں اس عمر میں برداشت نہیں کر سکا۔ میں اپنے بیٹے احمد تو خان خان کو اپنا جانشین مقرر کر کے اس دنیا سے نامراد جا رہا ہوں۔ اپنا عہد پورا کرنا وہ میری درج مدوح بن کر تمہیں راتوں کو جہنم سے سونے بھی نہیں دے گی تو خان

آدھی رات کے قریب خبر گاہ میں سے ایک مشعل بلند ہوئی اور وائیں بائیں ملی۔ اس اشارے کے ساتھ ہی لوں شور اٹھا جیسے پہاڑیاں سرک کر آگے بڑھ رہی ہوں اور اُن، پھر اوپر سے لڑھکتے پتے آرہے ہوں۔ سلطان محمود کے پیچھے ہونے والی سلجوقی کماندروں نے سلجوقی لشکر کے سامان کے ڈھیر کو آگ لگا دی، اور اس روشنی میں سلجوقیوں پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ اُن خیموں سے شعلے اٹھنے لگے جن میں سلجوقی گہری مینہ سوتے ہوئے تھے۔ غزنی کی فوج کی نفری سلجوقیوں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھی لیکن سولی سلجوقی فوج کو تباہ کرنے کے لیے سی دی سوار دستے کافی تھے۔ یہ کوئی لڑائی نہیں تھی، یہ

ترمز سے تقریباً ساٹھ میل جنوب میں آنگران کا پہاڑی علاقہ شروع ہو چکا ہے۔ یہ لشکر ان دو سلجوقی کماندروں کی رہنمائی میں آ رہا تھا جنہیں سلطان محمود نے بھیجا تھا۔ انہوں نے اس پہاڑی علاقے میں ایک خاص مقام پر لشکر کو بڑا کر دیا۔ انہوں نے اسرائیل سے کہا تھا کہ وہ اُسے اُس طرف بے جا رہے ہیں جہر غزنی کی فوج نہیں ہے۔ بڑا کر دیا گیا۔ سفر کا تھکا ہوا لشکر گہری مینہ سو گیا۔

آدھی رات کے قریب خبر گاہ میں سے ایک مشعل بلند ہوئی اور وائیں بائیں ملی۔ اس اشارے کے ساتھ ہی لوں شور اٹھا جیسے پہاڑیاں سرک کر آگے بڑھ رہی ہوں اور اُن، پھر اوپر سے لڑھکتے پتے آرہے ہوں۔ سلطان محمود کے پیچھے ہونے والی سلجوقی کماندروں نے سلجوقی لشکر کے سامان کے ڈھیر کو آگ لگا دی، اور اس روشنی میں سلجوقیوں پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ اُن خیموں سے شعلے اٹھنے لگے جن میں سلجوقی گہری مینہ سوتے ہوئے تھے۔ غزنی کی فوج کی نفری سلجوقیوں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھی لیکن سولی سلجوقی فوج کو تباہ کرنے کے لیے سی دی سوار دستے کافی تھے۔ یہ کوئی لڑائی نہیں تھی، یہ

جری مروجنہیں کوئی بھی زیر نہ کر سکا، کسی حسین و جمیل عورت یا سانپ کے ذہک سے مرے ہیں۔ عورت نے بادشاہیوں کو ٹکرایا ہے اور عورت نے اپنا آپ قربان کر کے بادشاہی کی گرگتی ہوئی عمارت کو تھاما اور انتظام بھی بننا ہے۔

جہاں یہودیوں کی تربیت یافتہ یہ دو مسلمان لڑکیاں سلطان محمود کے قتل کے لیے آئی تھیں وہاں مریم بھی تھی جو بیداری میں ماکہ بننے کے خواب دیکھا کرتی تھی۔ اور وہاں ایک غنبر بن بھی تھی جو ایک خان کے خیاں خان کی بی بی تھی۔ وہ اسی ماحول کی پروردہ تھی جس میں سلطان محمود غزنوی کا نام حقارت سے لیا جاتا تھا اور جس میں غزنی کی سلطنت کی جڑیں کاٹنے کے منصوبے بنے رہتے تھے مگر سلطان محمود کی نفرت اس کے لیے غصیت بن گئی تھی۔ اس نے مریم سے بھی کہا تھا کہ وہ سلطان محمود سے نہیں اسلام سے نفرت کا اظہار کر رہی ہے۔ اب یہ دو لڑکیاں اُس کے سامنے اسرائیل سلجوتی کی طرف بھیجی گئی تھیں۔

وہ ان لڑکیوں کو اچھی طرح جانتی پہچانتی تھی لیکن اُسے معلوم نہ تھا کہ ایک اجنبی صورت آدمی انہیں کمرے میں لے جا کر کیا پڑھاتا اور بند کمرے میں کیا ہوتا ہے۔ غنبر بن نے ان سے پوچھا تھا تو انہوں نے بتایا تھا کہ یہ ان کا اُمّ البق ہے۔ غنبر بن کو انیسویں سال ہوا تھا کہ اُسے اُمّ البق کی شاگردی میں کیوں نہیں بٹھایا جاتا۔ اُسے وجہ معلوم تھی۔ اُس کے خیالات کچھ اور تھے، وہ بات کچھ اور کرتی تھی اور وہ اسلام اسلام کی رٹ لگائے رکھتی تھی۔ وہ اس شاہی خاندان کی دوری لڑکیوں کی طرح شوخیوں اور کدکڑوں میں شب و روز نہیں گزارتی تھی۔ سب کہتے تھے کہ غنبر بن کو اس ہے۔

غنبر بن کو صرف وہ شوق تھے۔ گھوڑ ساری اور پیر اندازی۔ یہ تو اُس دور کا دستور تھا کہ لڑکیاں گھوڑ ساری، شتر ساری اور پیر اندازی سے خوب واقف ہوتی تھیں لیکن غنبر بن مردوں کے مقابلے میں گھوڑا دوڑاتی آواز دھڑکتے گھوڑے سے نشانے پر تیر چلائی تھی۔ اُس کا نشانہ کبھی خطا نہیں مچا تھا۔ وہ اکثر گھوڑا دوڑاتی جنگل میں دوڑ نکل جایا کرتی تھی۔

خان سے دوستی قائم رکھنا۔ الیگین کو بھی ساتھ رکھو۔ تم میں کوئی بھی محمود کو ایکلے شکست نہیں دے سکتا۔ میں الیگین کو تمہارے پاس بھیج رہا ہوں۔ ایک خان نے پیغام الیگین کے ساتھ بھیجا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ الیگین کے ساتھ دو لڑکیاں تمہارے پاس آ رہی ہیں۔ مریم انہیں اچھی طرح جانتی ہے۔ مرنے سے پہلے تمہیں ایک طریقہ بتانا ہوں۔

تم نے کہا تھا کہ تم سلطان محمود کو شکست نہ دے سکتے تو اُسے کسی اور طریقے سے مارو گے۔ ان دو لڑکیوں کو استعمال کرو۔ بڑی تیز اور ہوشیار لڑکیاں ہیں۔ سلطان محمود کی فوج میں چند ایک کماندار سلجوتی ہیں۔ ان لڑکیوں کو انہیں بھانسنے کے لیے غزنی بھیجو۔ یہ سلجوتی کمانداروں کے ساتھ شادی کر لیں گی، لیکن درپردہ دوسرے سلجوتیوں کو جو محمود کی فوج میں ہیں، اپنے جال میں پھانسی رہیں گی۔ انہیں باہر کے ایک آدمی نے تربیت دی ہے۔ تنہا نام بھی اسرائیل ہے لیکن وہ آدمی نئی اسرائیل ہے اس سے تمہیں شک نہ ہو کہ وہ یہودی ہے تو تمہیں پتا۔ ان پہنچائے گا۔ اُس کا ہدف سلطان محمود ہے۔ اُس نے وعدہ کیا ہے کہ سلطان کی فوج کے سلجوتیوں کو خریدنے کی ضرورت پڑی تو وہ نقد مدد بھی دے گا۔ اس ہم میں تم خرچ کرنے سے نہ ڈرو۔ احمد تو خان ہمیں مالی امداد دے گا۔

اسرائیل نے دونوں لڑکیوں کو دیکھا تو اُس نے محسوس کیا کہ وہ مریم کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھیں لیکن خوبصورت تھیں۔ ان لڑکیوں نے جب اسرائیل کے ساتھ بائیس شہروں کیس اور ناز و انداز دکھائے تو اس کے دہن سے مریم اُترنے لگی۔ ان دو لڑکیوں کو کچھ اور ہی کشش تھی۔ کوئی جا دوسا تھا جس نے ان لڑکیوں کی شکل و صورت ہی بدل ڈالی تھی۔ اسرائیل یوں اٹھ بیٹھا جیسا اُس نے آرائی مل گئی ہو۔

*

دوبے والے تنکوں کے سہارے ڈھونڈا کرتے ہیں۔ میدان میں شکست کھانے والے زیر زمین چلے جاتے اور سانپ بن جایا کرتے ہیں۔ بڑے بڑے

گھوڑا سوار دکھائی دیا جو سرپٹ دوڑتے گھوڑے سے مالیں اور بانیں تیر چلا رہا تھا۔ گھوڑا ایک طرف مڑ گیا۔ تب عمریزدانی نے دیکھا کہ گھوڑا سوار عورت ہے اور گھوڑے کے تماقب میں چار بھیریئے ہیں۔ عورت گھوڑے کو دالیں کبھی بائیں کر کے بھیریوں پر تیر چلائی تھی مگر بھیریئے اُس کی زد میں نہیں آتے تھے۔

اس علاقے کے بھیریئے بڑے ہی طاقتور اور خوشوار ہو کر تے تھے۔ گھوڑا بھیریوں کے دوسے بہت تیز دوڑ رہا تھا۔ اُسے آخر تھکا اور رُکنا تھا۔ عورت کے لیے بھیریوں کا مقابلہ اور اُن سے بچنا ناممکن تھا۔ عمریزدانی نے کمان میں تیر ڈال رکھا تھا۔ اُس کا گھوڑا تازہ دم تھا۔ اُس نے گھوڑے کو اڑھائی اہانس کا فوجی گھوڑا ہوا ہو گیا۔ چاروں بھیریئے اُس کے آگے آگے گھوڑا سوار عورت کے پیچھے دوڑے جارہے تھے۔ وہ گھوڑے تک تقریباً پہنچ گئے تھے۔ ایک نے اچھل کر گھوڑے کو پنجہ مار بھی دیا تھا اور ایک گھوڑے کے پہلو میں چلا گیا اور اچھل رہا تھا۔

عمریزدانی نے تیر نہ چلایا۔ وہ پہلو والے بھیریئے کے پیچھے گیا اور گھوڑا اُس پر چڑھا۔ یہ بھیریا گھوڑے تلے کھلا گیا۔ عمریزدانی نے گھوڑے کو پیچھے کو موڑا اور دوڑتے گھوڑے سے ایک بھیریئے پر تیر چلایا۔ بھیریئے نے پیچ مارا اور گھوڑے سے توجہ ہٹا کر دوسری طرف بھاگ اٹھا لیکن دُور نہ جاسکا۔ گر کر رہنے لگا۔ باقی دو بھیریئے اپنے دوساتھیوں کا انجام دیکھ کر بھاگ گئے مگر عورت کا گھوڑا ایسا ڈرا ہوا تھا کہ بے لگام ہو گیا تھا۔ رُک نہ سکیں تھا۔ عمریزدانی نے اپنا گھوڑا اُس کے پس منظر میں کر لیا۔ تب اُس نے دیکھا کہ سوار عورت نہیں بلکہ بڑی خوبصورت جوان لڑکی ہے اور وہ کوئی شہزادی معلوم ہوتی ہے۔

عمریزدانی نے دوڑتے گھوڑے سے جھک کر لڑکی کے بے لگام گھوڑے کے منہ کے قریب سے لگام پکڑ لی اور اُسے اپنے قابو میں لے لیا۔ لڑکی کھپڑی ہوئی نہیں اپنی ہوئی تھی۔ اُس نے جب شکریہ ادا کیا تو عمریزدانی نے اس

سلجوقی نقصان تو بہت اٹھائے تھے۔ اُن کے گھوڑے اور ادبست بھی پیچھے رہ گئے تھے لیکن سلطان محمود کو معلوم تھا کہ اس قبیلے کی تعداد کم نہیں۔ ایک خان کی فوج بھی بھو قیوں کی اتحادی تھی۔ وہ کسی بھی روز سرحدوں پر چھڑچھاڑ کر سکتے تھے۔ اُن پر نظر رکھنا ضروری تھا۔ چنانچہ سلطان محمود نے حکم دے دیا تھا کہ اپنی فوج کی گشت سرحدوں سے باہر جتنی دُور تک جا سکے مل جایا کرے۔

عمریزدانی فوج میں کمانڈر تھا۔ اس کے ماتحت تین سرحدی چوکیاں تھیں۔ یہ سرحد اُس علاقے سے ملتی تھی جو ایک خان کا تھا۔ یہ دریائے اُکس کے پار کا علاقہ تھا۔ سلطان محمود نے دو چوکیاں دریا کے پار بنا دی تھیں۔ ان کی نفری کے لیے دریا میں ہر وقت کشتیاں موجود رہتی تھیں۔ عمریزدانی اسی چوکی میں رہتا تھا۔ ایک روز وہ گشتی سنتریوں کو دیکھنے کے لیے چلا گیا کہ وہ کہیں بیٹھ تو نہیں جاتے۔

اُس نے دُور سے دیکھا کہ گھوڑا سوار سنتری چلے جا رہے تھے۔ وہ انہیں دیکھتا رہا۔ وہ کہیں رُکے نہیں اور آگے جا کر جنگل میں غائب ہو گئے۔ اُدھر جانا عجیب نہیں تھا۔ عمریزدانی دوسری طرف نکل گیا۔ وہ کمانڈر تھا۔ اُس کے پاس کمان اور ترکش نہیں ہونی چاہیے تھی لیکن گشت پر جاتے وہ کمان اور ترکش ساتھ لے جاتا تھا۔ دشمن کے علاوہ اُس علاقے میں ہرن اور غرگوش ہوتے تھے جن کا شکار دھبب تھا۔ اُس روز اُسے دُور ہرنوں کا ایک جوڑا نظر آیا۔ عمریزدانی نے گھوڑے کا رُخ اُدھر کو کر لیا اور کمان میں تیر ڈال لیا۔ وہ چھب چھب کر ذرا پھر کاٹ کے جا رہا تھا کہ ہرنوں کو خبر نہ ہو لیکن ہرن ماں سے چل پڑے اور دُور ہی دُور ہٹے گئے۔ عمریزدانی ہرنوں میں ایسا لگن ہوا کہ دیکھ نہ سکا کہ وہ کتنی دُور نکل گیا ہے۔ آگے علاقہ چٹانی آ گیا تھا۔

ہرن سرپٹ دوڑ پڑے جیسے دُور گئے ہوں۔ دُور سے دوڑتے گھوڑے کے نالوں سناں دینے لگے جو قریب آ رہے تھے۔ عمریزدانی رُک گیا۔ اُسے ایک

”میرے لیے کیا حکم ہے؟“ عزیزدانی نے پوچھا۔ ”میں آپ کا دشمن ہوں اور آپ کی سرحد کے اندر آگیا ہوں۔ کیا میں آپ کا قیدی ہوں؟“
 ”نہیں.... آپ ہمان ہیں“۔ عنبرین نے کہا۔ ”اگر آپ جلدی میں ہیں تو آپ جا سکتے ہیں۔ مجھے جلدی ہے۔ بہت دیر ہوگئی ہے۔ وہ مجھے ڈھونڈ نہ رہے ہوں۔“

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ آنکھوں سے آنکھیں اور سکرپٹ سے سکرپٹ مچکرائی۔ عزیزدانی نے سرگوشی کی۔ ”خدا حافظ شہزادی!“۔ اور اُس نے گھوڑا مولہ گھوڑا چلا ہی تھا کہ اُسے عنبرین کی آواز سنائی دی۔
 ”بھڑیئے۔ کل پھر آئیں گے؟“۔ عنبرین نے کہا۔ ”میں یہیں آ جاؤں گی۔“

”مجھے گرفتار کرنے کتنے آدمی آئیں گے؟“۔ عزیزدانی نے پوچھا۔
 عنبرین کی سکرپٹ غائب ہوگئی۔ اُس کا چہرہ بھگ گیا۔
 ”آپ مجھ پر ایسا شک کر سکتے ہیں؟“۔ عنبرین نے بڑے ہی اداس لہجے میں کہا۔ ”میں آپ کو یقین نہیں دلا سکتی کہ میں آپ کو دھوکہ نہیں دوں گی۔ آپ کہیں تو میں آپ کی چوکی تک آ جاؤں گی۔“
 ”میں آؤں گا۔“

وہ چلا گیا تو عنبرین اُسے وہیں کھڑی دیکھتی رہی۔
 عزیزدانی نے خطرہ محسوس کیا اور اگلے روز وہیں چلا گیا جہاں اسے عنبرین ملی تھی۔ اس ملاقات میں ان میں بے تکلفی پیدا ہوگئی۔ پھر اُن کی ملاقاتیں ہر روز ہونے لگیں۔ پانچ چھ روز بعد کی ایک ملاقات میں عنبرین کچھ گھڑائی گھڑائی سی تھی۔
 ”مجھے تمہاری محبت بے آبی ہے مگر اب ہم خطرے میں ہیں“۔ عنبرین نے کہا۔ ”اپنی ایک ملازمہ نے کل مجھے بتایا ہے کہ میرے ہر روز جنگل میں نکل جانے پر شک کیا جانے لگا ہے اور ہو سکتا ہے میرا تعاقب کیا جائے۔ مجھے اپنی پرواہ نہیں۔ میں مرنے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے تمہارا فکر ہے۔ ذرا ہوشیار رہنا۔“

کالب دلجو سن کر پوچھا۔ ”ایک خانی؟“
 ”ہاں.... اور آپ؟“
 ”غزنی“۔ عزیزدانی نے کہا۔ ”میں غزنی کی فوج میں کماندار ہوں۔ ایک ہرن کے پیچھے بہت دُور نکل آیا تھا۔ آپ کا گھوڑا اور اس کے تعاقب میں بھیڑیے دیکھے....“

”کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ اپنی سرحد سے کتنا باہر آ گئے ہیں؟“۔
 راک کی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آپ ہماری سرحد میں ہیں اور ہم ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔“

”ایک خان مر گیا ہے۔“ عزیزدانی نے کہا۔ ”زندہ تھا تو بھی مرا ہوا تھا۔ ہم اُس کی جان بھی کی نکال چکے تھے۔ آپ کون ہیں؟“
 ”میرا تعلق ایک خان کے خاندان سے ہے۔“۔ راک نے کہا۔ ”میرا نام عنبرین ہے۔“

”تو آپ شہزادی ہیں؟“۔ عزیزدانی نے کہا۔ پھر آپ نے ٹھیک کہا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ اچھا نہیں لگتا کہ میں ایک عورت کے ساتھ طنز یا دھڑکی آمیز باتیں کروں.... شہزادی عنبرین! آپ ابھی اُنہیں عمر کو نہیں پہنچیں جس میں انسانی اچھے اور بُرے، دوست اور دشمن کو پہچان سکتے ہیں۔ میں آپ کو ایک نصیحت کرنا چاہتا ہوں۔ اپنے دل سے سلطان محمود کی دشمنی نکال دیں اور اپنے بچوں کو بھی یہی بتائیں کہ ایک مذہب کے دو انسان آپس میں دشمن نہیں ہو سکتے۔“

”مجھے اپنا دشمن نہ سمجھیں۔“۔ عنبرین نے کہا۔ ”مجھے آپ کی نصیحت کی ضرورت نہیں۔ میرا خاندان مجھے باطل کہا کرتا ہے کیونکہ میں غزنی کی نفرت کی نہیں محبت کی باتیں کیا کرتی ہوں۔ آج خدا نے شاید اسی کا انعام دیا ہے کہ مجھے بھڑیوں سے بچانے کے لیے ہمارے ایک دشمن کو جلدی سرحد کے اندر بھیج دیا ہے.... اور، میرے خدا! اگر آپ نہ آتے تو یہ بھڑیئے مجھے چہرہ بھار کر کھا جاتے۔“

اگر وہ آگے تو میں واپس نہیں جاؤں گی۔ اگر کل بھاگنے کا موقع مل گیا تو میرے ساتھ ہی جاؤں گی۔ کیا تم ساتھ لے چلنے کے لیے تیار ہو؟
 ”تو کیا میں تمہارے ساتھ مذاق کر رہا ہوں جو ہر روز سرحد پھلانگ کر اتنی دُور خطرے میں آجاتا ہوں؟“ عزیز دانی نے کہا۔
 انہیں کچھ اور کہنے اور سوچنے کا موقع نہ ملا۔ انہیں گھوڑوں کے پاپرنائی دینے۔

”وہ آگے ہیں“۔ عزیز بن نے کہا۔

”دیکھو“۔ عزیز دانی نے کہا۔ ”وہ آ رہے ہیں!“

تین گھوڑوں پر تیزی سے سوار ہوئے۔ اُن تین گھوڑوں نے ایڑیں لگا دیں۔ عزیز دانی اور عزیز بن نے گھوڑے دوڑا دیئے۔ پیچھے سے تین زیر اکٹھے آئے جن میں سے دو عزیز بن کے گھوڑے کی پیٹھ میں اتر گئے۔ گھوڑا بڑی زور سے ہنبایا۔ عزیز دانی نے دیکھ لیا۔ اُس نے اپنا گھوڑا عزیز بن کے گھوڑے کے پہلو میں کر لیا اور ایک بازو عزیز بن کی کمر کے گرد لپیٹ کر کہا کہ وہ اُس کے گھوڑے پر آجائے۔ گھوڑوں کی رفتار بہت تیز تھی۔ عزیز بن عزیز دانی کے سہارے اس کے گھوڑے پر اس کے آگے آگئی۔ ان کے قریب ستین پیر گزر گئے۔

عزیز دانی نے گھوڑے کو دائیں بائیں کرنا شروع کر دیا تاکہ تیر انداز اُسے نشانے میں نہ لے سکیں۔ آگے چائیں آگئیں۔ عزیز دانی نے گھوڑا ان میں داخل کر دیا اور وہ محفوظ فاصلے پر پہنچ گیا۔ پھر سرحد آگئی اور وہ اپنے علاقے میں داخل ہو کر تعاقب میں آنے والے جانے کہاں سے واپس چلے گئے تھے۔

یہ ایک سال پہلے کا واقعہ تھا۔ اب سلطان محمود ہندوستان کو جا رہا تھا۔ اب اُس نے اپنے سالاروں اور کمانداروں کو اجازت دے دی تھی کہ وہ

اپنی بیویوں کو ساتھ لے جانا چاہیں تو لے جاسکتے ہیں۔ یہ اجازت اُس نے اس لیے دی تھی کہ اب وہ ہندوستان کے کسی علاقے میں اپنی باقاعدہ حکومت قائم کرنا چاہتا تھا اور وہاں فوج بھی رکھنی تھی۔ اُس کے پیش نظر لاہور تھا لیکن اس سے پہلے اُسے ہمارا جوں کے سر کھینچنے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ خطرناک لاہور کا مہاراجہ ترلوچن پال تھا۔ اُسے اطلاع مل چکی تھی کہ ترلوچن پال اپنی فوج قنوج اور مستھرا کے درمیان کہیں لے گیا ہے اور وہی وہ سرے ہمارا جوں کو متحد کرنا پھر رہا ہے۔

سلطان محمود کی اجازت پر چند ایک سالار وغیرہ اپنی بیویاں ساتھ لے جا رہے تھے۔ عزیز بن عزیز دانی کی بیوی بن چکی تھی۔ عزیز دانی اُسے ساتھ نہیں لے جانا چاہتا تھا لیکن عزیز بن کی ضد اتنی شدید تھی کہ عزیز دانی کو اسے ساتھ لے جانا پڑا۔ اس عید میں محبت کا مائل دخل اتنا نہیں تھا جتنا جذبے کا تھا۔ عزیز بن نے عزیز دانی سے کہا تھا کہ مجھے خدا سے شکوہ ہے کہ مجھے عورت بنا کر پیدا کیا۔ میری روح کھڑکے خلاف میدان جنگ میں بھٹکتی رہتی ہے۔

”کافر سے زیادہ خطرناک ایمان فروش ہوتا ہے۔“ عزیز دانی نے اسے کہا تھا۔ کافر کو سب جانتے ہیں کہ کافر ہے اور مہاراجہ بن ایمان فروش کا کوئی مجبور سہ نہیں ہوتا۔ بھائی بنا رہتا اور پیٹھ میں چھرا گھونپ کر بھی کہتا ہے کہ میں تمہارا بھائی ہوں... تم ایمان فروشوں کے خاندان کی لڑکی ہو۔ میں حیران ہوں کہ تمہاری روح کھڑکے خلاف کیوں بھڑکی رہتی ہے؟“

”میری ماں کا ایمان فروشوں کے خاندان سے کوئی تعلق نہیں تھا۔“ عزیز بن نے کہا۔ ”میرا باپ ایک خالی تھا۔ اُس نے میری ماں کو کہیں سے زبردستی اغوا کیا تھا۔ میں پیدا ہوئی اور جب سے میرا شعور بیدار ہوا ہے ماں مجھے بتا رہی ہے کہ یہ ایک خالی مسلمان ہو کر اسلام کے لیے سب سے بڑا خطرہ بنے ہوئے ہیں۔ ماں مجھے بچپن سے سلطان محمود کی باتیں سنا رہی ہے۔ میں تصور میں اس عظیم سلطان کو دیکھتی رہی ہوں۔ میں ماں باپ کی اکیلی اولاد ہوں۔“

کی ذلت کا انتقام نہیں لینا ہے۔ اچھا ہے کہ تم غزنی کی فوج میں ہو۔
”ہم سلطان محمود کو قتل کر دیں گے۔“ رجب بایجان نے کہا۔

”میں سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ وہاں بیٹھے ہوئے ایک اندامی نے کہا۔
— وہ ہم تمہیں بتائیں گے کہ نہیں کیا کرنا ہے۔۔۔ پہلا کام یہ ہے کہ غزنی کی فوج میں جتنے سبوتی ہیں انہیں دہرہ لہے ساتھ ملا لو۔ ان پر جب ہمیں اعتماد پیدا ہو جائے تو انہیں بتانا کہ کیا کرنا ہے۔ تم کا انداز ہو جیگا، امود کو بکھتے ہو۔ سلطان محمود کو ہندوستان میں میدان جنگ میں دھوکہ دینا ہے۔ وہ خواہ زندہ رہے، اس کی فوج کو تباہ کرنا ہے۔ وہ کسی نہ کسی وقت ہندوستان پر فوج کشی کرے گا۔ تم ساتھ ہو گے۔ تم دشمن کے ساتھ مل کر اس کی فوج کے پہلو پر یا عقب سے حملہ کرا سکتے ہو۔“

”لیکن وہاں دشمن کے ساتھ رابطہ کیسے ہوگا۔“ رجب بایجان نے کہا۔
”ہم وہاں کی زبان نہیں جانتے۔“

”تمہارے پاس ذریعہ موجود ہے۔“ سفید ریش نے کہا۔ ”ادیر ذریعہ غزنی میں جگہ جگہ موجود ہے۔ یہ وہ ہندو ہیں جنہیں غزنی کی فوج ہر حملے کے بعد جگی تیرہوں کی حیثیت سے ساتھ لاتی رہی ہے۔ محمود نے ان میں سے وفادار منتخب کر کے ان کے دوستے تیار کر لیے ہیں۔ باقی ہزاروں قیدی سرکاری ملازم ہیں اور ان میں سے زیادہ تعداد لوگوں نے غریبی کھلی۔ وہ اب ان کے ذاتی ملازم ہیں۔ ہم تمہیں ایسے چار بائچ ہندو دیں گے جو مسلمانوں کے گھر واپس تمہارے ملازم ہوں گے یا گاڑی بان بن کر ساتھ جائیں گے۔ وہ ہندوستان میں تمہارے ماہنامہ ہوں گے۔ دشمن سے تمہارے رابطے کا ذریعہ بنیں گے۔ ہم انہیں اسٹی دولت دیں گے جو انہوں نے کبھی خواب میں نہیں دیکھی۔ انہیں سب سے بڑا انعام یہ ملے گا کہ انہیں آزادی مل جائے گی اور وہ ہندوستان میں رہ جائیں گے۔ میدان جنگ میں ایسے حالات تم پیدا کرو گے کہ غزنی کی فوج کے پورے پورے دستے دشمن کی زد میں آ جائیں!“

ماں کہا کرتی ہے کہ خدا اُسے صرف ایک بیٹا دے دے تو وہ اُس کے ہاتھوں قوم کے ان غلاموں کو ختم کرائے۔ اُسے خدا نے بیٹا نہ دیا۔ اب یہ میل فرض ہے کہ ان غلاموں اور ایمان فروشوں کو ختم نہ کر سکیں تو حتیٰ پرستوں کا تو ساتھ دوں۔۔۔ میں تمہارے ساتھ بیوی کی حیثیت سے نہیں، بچا بہ کی حیثیت سے جاری ہوں۔ تم ساتھ نہیں لے چلو گے تو تم جانتے ہو کہ میں گھوڑ سوار ہوں، تیرا نڈ بھی ہوں، فوج کے پیچھے پیچھے آ جاؤں گی۔ مجھے کچھ کرنا ہے مگر اچھے کچھ کر لے دو۔ عورت تمہارا ایک بازو ہے۔ اسے توڑ کر گھر میں نہ پھینکو۔“
وہ عمر کے ساتھ جاری تھی۔ یہ فوجی فائدہ کی سیل لبا تھا۔ رسد کی گھوڑا گاڑیاں سینکڑوں تھیں۔ پانکیاں بھی ساتھ تھیں جن میں عورتیں تھیں۔ پانکیاں ایک دوسری سے بہت دور دور تھیں۔

✱

اور اس فوج کے ساتھ اسی فوج کے دشمن بھی جا رہے تھے۔ یہ پچاس سالہ سبوتی تھے جو بہت عرصے سے غزنی کی فوج میں تھے اور ان کی وفاداری پر کسی کو شک نہیں تھا مگر تھوڑے ہی عرصے سے ان کی وفاداری دہرہ منسکوک ہو گئی تھی۔ کسی کو ان کی بدلی ہوئی نیت کا علم نہ ہو سکا۔ ان میں ایک کا نڈ رجب بایجان تھا جس نے ڈیڑھ ایک سال پہلے شادی کی تھی۔ ایک اور سبوتی لی بھی شادی ہوئی تھی۔ ان دونوں کی شادیوں کے بعد غزنی کی فوج کے سبوتیوں میں یہ تبدیلی آئی تھی کہ وہ اکٹھے رہنے لگے تھے۔

کسی کو معلوم نہیں تھا کہ ان دونوں کو یہ بیویاں انعام کے طور پر ملی تھیں۔ دونوں چند دنوں کی رخصت پر گئے تھے۔ وہاں ایک سفید ریش آدمی تھا اور کچھ اور سرکردہ لوگ بھی تھے سفید ریش نے ایسے الفاظ اور ایسے انداز سے ان دونوں کے ساتھ باتیں کی تھیں کہ دونوں کے خون اُبل پڑے پھر ان کے آئینوں کے آئینے تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ غزنی کی فوج میں واپس نہیں جائیں گے۔

سیر بُردلی ہے۔ سفید ریش نے کہا تھا۔ ”نہیں انتقام لینا ہے سبوتیوں

آگے رکھا گیا، اس نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ اس کے ساتھ آزاد
سلطنت سلجوق کی سالاری کا وعدہ ایسا عالم تھا جو ان دونوں سلجوقیوں کے
تصوروں کے احاطے سے باہر تھا۔ دونوں لڑکیوں کو الگ تربیت دی گئی
تھی۔ انہیں ان دونوں کی نگاہیں اپنے ہاتھ میں رکھنی تھیں اور انہیں
ہندوستان جاکر غزنی کی فوج کے اہم کمانداروں اور نائب سالاروں کو اپنے
جال میں پھانسا اور دھولکے سے مروانا تھا۔

تھوڑے سے عرصے میں رجب بائیں جانب اور اس کے ساتھ فرید سمرقند
نے غزنی کی فوج کے سلجوقیوں کو سلطان محمود کے خلاف بھڑکالیا۔ انہیں کچھ نقد
دیا، کچھ سبز باغ دکھائے اور ان دونوں سلجوقی کمانداروں کی بیویوں نے انہیں اپنی
جھلک دکھائی اور اکیلے اکیلے سلجوقی کو اپنے گھر لاکر سلجوقیوں کی مظلومیت اور
ان کو غزنی کی فوج کا ظلم و تشدد ایسے انداز سے بنایا کہ پتھر بھی جیسے لشکبار ہو
گئے تھے۔ اگر کوئی عورت کسی مرد کو بھڑکائے تو وہ بھڑکے۔ ایک عورت نے
اُس کی مردانگی کو لٹکا رہے۔ وہ فوراً بھڑک اٹھا ہے۔ بھڑکانے والی دو بڑی
خوبصورت لڑکیاں تھیں۔ انہوں نے اپنا جادو چلایا۔

*

اب ۶۱-۶۰ء کے موسم سرما کے آغاز میں جب سلطان محمود ہندوستان
کی طرف آ رہا تھا تو اُس کی آستین میں بہت سے سانپ بھی ساتھ آ رہے تھے۔
آٹھ دس ہندو بھی گاڑی بالوں اور سائیسوں کے بہروپ میں ساتھ تھے۔
وہ گنگا اور جنا کے درمیانی علاقے کے رہنے والے تھے۔ انہیں اچھی طرح
سمجھا دیا گیا تھا کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ غزنی کی فوج جب ہندوستان میں داخل
ہوئی تو ان ہندوؤں کے جسموں میں یوں جان آگئی جیسے پانی سے نکالی ہوئی
بھلی کوبانی میں پھینک دیا جائے۔ اُن کے دماغ اور تیز ہو گئے۔

ہندوستان میں حالات تیزی سے سلطان کے خلاف ہو رہے تھے۔
باری میں مہاراجہ جنموج راجیہ پال ایک لڑکے کے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا جو ہندوؤں

”تم سلطان محمود کی جنگی جانوں کو اچھی طرح سمجھتے ہو۔ ایک اور آدمی نے کہا
— وہ وسیع پیمانے پر گھات لگاتا ہے اور وہ تھوڑی سی نفرتی سے سامنے
سے حملہ کرتا اور زیادہ تر نفرتی کو دایمیں بائیں تقسیم کر کے پہلوؤں سے اور عقب
سے حملہ کرتا ہے۔ وہ دشمن کو آگے گھسیٹ لاتا ہے۔ اس کے چھاپہ باز دشمن
کو رات کو بھی چپن نہیں لینے دیتے۔ تم دھیان رکھنا۔ اُس کی چال دیکھو تم دشمن
کو قبل از وقت خبردار کرو۔ محمود ہمیں گھات لگائے تو دشمن کو بتادو۔ تم جانتے
ہو کہ سالار جو ساتھ جائے گا وہ کتنا تجربہ کار اور گھٹا ہے۔ ابو عبد اللہ محمد الطائی
سلطان محمود کا دایاں بازو ہے۔ اس سالار نے تاریخ میں اپنا نام مکھ دیا ہے۔
آنے والے سلیس جہاں سلطان محمود کو یاد کیا کریں گی، وہاں وہ ابو عبد اللہ محمد الطائی
کا نام بھی لیا کریں گی۔ میدان جنگ میں اگر موقع دیکھو تو اُسے قتل کر دو۔ دُور
سے پیر چلا سکتے ہو لیکن پکڑے نہ جانا پکڑے جانے کی صورت میں بہادرانہ منصوبہ
خاک میں مل جائے گا۔“

”اسی لیے ہم سلطان محمود کے قتل کی بات نہیں کرتے“ سفید ریش نے کہا
— ”اُسے ہم غزنی سے ہزاروں میل دور ہندوستان کے وسط میں ہندوؤں کے
ہاتھوں شکست دلانا چاہتے ہیں اور اُس کی ایسی حالت کرانا چاہتے ہیں کہ غزنی
کی فوج تباہ اور قید ہو جائے اور محمود یا گلوں کی سی حالت میں ہندوؤں کا قیمتی
نہو جائے۔“ سفید ریش نے جوش جذبات سے کہا — ”پھر بادشاہی سلجوق کی
ہوگی۔ سلجوق ایک طاقت کا نام ہے۔ سلجوقی اسلام کی طاقت نہیں گے پھر
سلطنت سلجوق وسیع ہوتی جائے گی۔“

”اور تم اُس کی فوج کے نائب سالار اور سالار ہو گے۔ ایک اور آدمی
نے کہا — ”ہم تم دونوں کو وہ بیویاں دے رہے ہیں جو صرف بادشاہوں کے
ہاں نظر آتی ہیں اور ایک خزانہ ہمارے لیے وقف کر دیا ہے۔“

ایک تو انہیں جذبات سے مغلوب کیا گیا، دوسرے انہیں جو حسین
لڑکیاں دی گئیں، ان کے حسن نے ان کی عقل پر قبضہ کر لیا اور جو خزانہ ان کے

کے تین بہاراجوں کی سازش کا نتیجہ تھا۔ راجیا پال کا بیٹا کھن پال بھی باری میں تھا۔ باری قنوج سے دُور ایک قصبہ تھا جہاں راجیا پال نے قنوج کے غزنوی قلعہ دار سالار ابوالقادر سلجوقی کی منظوری سے اپنی نئی راجدھانی آباد کر لی تھی اور اُس نے کچھ فوج بھی رکھ لی تھی، لیکن اس فوج پر غزنوی کی فوج کے افسروں کی نگرانی تھی۔ بہاراج راجیا پال کا بیٹا کھن پال سچ دتا بکھاتا رہتا تھا مگر بے بس تھا۔

راجیا پال ایک سازش کے تحت قتل ہو گیا تو دہاں غزنوی کی فوج کے جوا فسر تھے، انہوں نے کچھ دھڑ شروع کر دی مگر یہی کارروائی بناوٹ کا باعث بن گئی۔ غزنوی کی فوج کی تو دہاں کوئی نفری نہیں تھی۔ چند ایک کماندار اور ہمدرد تھے کھن پال نے درپردہ اپنی مختصر سی فوج کو تیار کر لیا اور اگلی ہی اس فوج نے غزنوی کے ان افسروں کو پکڑ لیا۔ ان میں سے صرف ایک کسی طرح بچ گیا۔ وہ قنوج کی طرف دوڑا۔ فوج کی کچھ نفری دہاں موجود تھی گردہ راستے میں پکڑا گیا۔ تب پتہ چلا کہ قنوج اور باری کے راستے میں ایک فوج موجود ہے جس نے قنوج اور باری کا رشتہ توڑ رکھا ہے۔

یہ ایک متحدہ فوج تھی جس میں تین ریاستوں کی فوج شامل تھی۔ ایک کالنجہر کے بہاراج گندہ کی، دوسری گوالیار کے بہاراج اجین کی اور تیسری لاہور کے بہاراج ترلوچن پال کی۔ ترلوچن پال نے اپنی فوج ہمیں دُور رکھی ہوئی تھی۔ اس متحدہ فوج میں قنوج کی شکست خوردہ فوج کے بھگوزے بھی شامل ہو گئے تھے اور اس میں باری کی فوج کی نفری بھی شامل تھی۔

اس کے علاوہ ایک فوج اور تھی جس کا ذکر تاریخ میں ملتا ہے لیکن اس کی تعداد کسی نے نہیں لکھی۔ یہ ہندوستان کے شہریوں کی فوج تھی یعنی رضا کار فوج۔ جس قوم کے دیوتاؤں کے بُت توڑے گئے اور مورتیاں پھاڑ کر باہر پھینکی گئی تھیں اور جن کا کعبہ جیسا مقدس مقام ستر مسلمانوں نے بُتوں سمیت تباہ کر دیا تھا، وہ قوم چین سے نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ اس قوم کا پچھلے پچھلے کی طرح ذمہ دار نے

کو تیار تھا۔ ہندو عورتوں نے اپنے زیورات مندروں کے حوالے کر دیئے تھے۔ پنڈتوں نے دہشت پھیلا رکھی تھی کہ دیوتاؤں کا قبر پوری ہندو قوم کو بھسم کر دے گا۔ ہندو یہ نہیں دیکھتے تھے کہ اُن کے بُت اُس روز سے انہیں دُرا رہے تھے جس روز محمود غزنوی نے ہندوستان کے پہلے مند کے بُت توڑے اور ہندوؤں سے کہا تھا کہ یہ ہے تمہارا دیوتا۔ اسے کہو کہ اپنے ٹکڑے جوڑ کر مجھے اپنی توہین کی سزا دے۔

سلطان محمود نے ہندوستان میں پہلا بُت بیس سال پہلے ۱۰۱۰ء میں توڑا تھا، پھر اُس نے تھانہ سر اور کھرانک کے بُت توڑ کر باہر پھینکے اور اُن کے ٹکڑوں پر اپنی فوج گزار کی تھی۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق ہا بھارت کی سلاستی انہی بُتوں کی بدولت تھی۔ یہ نہ ہوئے تو ایک بھی ہندو زندہ نہیں رہے گا لیکن بیس برسوں میں کسی بھی ٹوٹے ہوئے دیوتا نے اور ہری کرشن نے اور ہر ہمدرد ہوئے اور چار ہاتھوں والی دیوی نے کسی ردِ عمل اور غصے کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن توہم پرست قوم کو فریب کار پنڈتوں نے ایسی زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا کہ تیز ہوا چلتی تھی تو وہ ہاتھ جوڑ کر بھجن گانے لگتے تھے کہ آیا دیوتاؤں

کا قبر نقی اور زیورات کی قربانی کو کو وہ سہلی سمجھتے تھے۔ وہ اپنی کواکسی سٹیوں کو پنڈتوں کے حوالے کر دیا کرتے تھے۔ اُن کے دنوں میں مسلمانوں کے خلاف جو کمزورت، نفرت اور انتقام کی آگ بھری گئی تھی، وہ آج بھی اُسی شدت سے موجود ہے جیسی ایک صدی پہلے تھی۔

اب سلطان محمود غزنوی کی ایک اور پیش قدمی کی خبر پھیلی تو ہندوؤں نے اپنا تان من، دھن قربان کر دیا۔ جوان آدمی جو گھوڑ سواری، نیزہ بازی، تیغ زنی اور تیر اندازی کی سوجھ بوجھ رکھتے تھے، فوجوں میں چلے گئے۔ جوان لڑکیاں بھی لڑنے کو تیار ہو گئیں۔ مندروں کے سکھ جنہیں لگے اور گھنٹیاں واویلا پانے لگیں۔ غزنوی کی فوج ہندوؤں کے لیے دہشت بنی ہوئی تھی لیکن اُس دُور کے ہندو ایسے لگے گزرے نہیں تھے۔ اُن پر مذہب کا جنون طاری تھا ہندو

سلطان محمود کی پیش قدمی صبح معنوں میں برق رفتار ہوا کرتی تھی۔ اب کے تو وہ اور زیادہ تیزی سے باری پہنچا کیونکہ باری میں اُس کے کمانڈر اور عیدار ہندوؤں کی قید میں تھے اور وہاں دشمن کی فوج جمع ہو رہی تھی۔ اُس کے ساتھ ہندو کمانڈر تھے۔ اُس نے آرام کیے بغیر باری پر بلہ بول دیا اور فوج کو حکم دیا کہ اس شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے۔ باری میں فوج کوئی ایسی زیادہ نہیں تھی۔ اس نے جلدی ہی ہتھیار ڈال دیئے سلطان محمود باری کو شاید تباہ نہ کرنا لیکن اُسے اطلاع ملی کہ ہندوؤں نے غزنی کے قیدی کے ہوئے افندوں کو قتل کر دیا ہے سلطان نے حکم دیا کہ اس شہر کو صاف کر دو۔ چنانچہ باری کو اس طرح تباہ کیا گیا کہ کوئی مکان کھڑا نہ رہے دیا گیا۔ سدر کا قلعہ بھی اٹھا کر دیا میں پھینک دیا گیا۔

اصل مقابلہ تو مہاراج گنڈہ اور مہاراج ارجن کے ساتھ تھا۔ سلطان کو ان دونوں مہاراجوں کی افواج کی لوہڑیوں کی اطلاع ملی رہی تھیں اور وہ سوچ رہا تھا کہ وہ کون سی چال چلے کہ دونوں فوجوں کو الگ الگ کر دیے یا دونوں کا مقابلہ کرے۔

”لیکن سلطان مجھ سے!“ اُس کے دوست راست سالار ابو عبد اللہ محمد الطائی نے اُسے کہا۔ ”ابھی تک یہ نہیں چلا کہ لاہور کی فوج کہاں ہے۔ غلط تو اُس سے ہے۔ ہم جب حملہ کریں گے تو لاہور کی فوج ہم پر عقب سے یا پہلوؤں سے آجائے گی۔“

یہ باتیں جو ہی رہی تھیں کہ غزنی کی فوج میں شور سا بپا ہو گیا سلطان محمود نے جسے نکلا اور قاصد کو دوایا کہ جا کے معلوم کرے یہ شور کیا ہے۔ قاصد نے واپس آکر جو اطلاع دی اُس نے سلطان کو پریشان کر دیا۔ اطلاع یہ تھی کہ چارڈنڈار اور چار سپاہی مکینوں میں ہوا بھر کر دیا میں اتر گئے اور دیا بار کر گئے میں سلطان اور سالار کو پریشانی یہ تھی کہ یہ آٹھ آدمی بھگورے ہو گئے ہیں اور وہ دشمن سے جا ملیں گے۔ ان کا تعاقب آسان نہیں تھا پھر بھی

لاچپوت مرنے کے لیے لڑتے تھے۔ دہری سے لڑتے تھے۔ جان کی قربانی کو وہ کوئی غیر معمولی قربانی نہیں سمجھتے تھے۔

یہ ایک الگ فوج تھی جو چٹانوں کی طرح غزنی والوں کے راستے میں کھڑی ہو گئی تھی۔ باقاعدہ فوج جو مہاراجوں نے اکٹھی کر لی تھی، اس کی تعداد ایک لاکھ سینتالیس ہزار زیادہ تھی تیس ہزار گھوڑ سوار اور چھ سو چالیس جنگی ہاتھیوں پر مشتمل تھی۔ (غزنی نے ہاتھیوں کی تعداد نو سو کھی ہے)۔

سلطان محمود کو بشارت سے آگے نکلتے ہی اطلاعات ملیں شروع ہو گئی تھیں کہ دشمن کی فوج کتنی ہے اور کہاں کہاں ہے۔ وہ دریائے پنجاب عبور کر رہا تھا جب اُسے یہ اطلاع ملی کہ باری میں چھپن والی فوج نے غزنی کے چند ایک کمانڈروں اور عیداروں کو قید کر لیا ہے اور خطرہ ہے کہ قلعہ کے قلعے کا مہرہ ہو جائے گا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک اور جاسوس آیا جس نے سلطان کو بتایا کہ قلعہ کے محاصرے کا کوئی امکان نہیں کیونکہ مہاراج گنڈہ اور مہاراج ارجن اپنی جنگی قوت کی افراط سے کھلے میدان میں لڑنے کو تیار ہیں۔

اس جاسوس نے سلطان کے ساتھ غزنی کی فوج کا جائزہ لیا تو اُس نے کہا کہ ہندوؤں کی افواج کے مقابلے میں یہ فوج تھوڑی ہے۔

”لاہور کی فوج کہاں ہے؟“ سلطان محمود نے پوچھا۔

”جنا کے کنارے کسی جنگل میں ہے۔“ جاسوس نے جواب دیا۔

”اُس کی صبح خیرہ گاہ کا پتہ نہیں چلا یا جاسکا۔ کوشش جاری ہے۔ غلطی اسی کا زیادہ ہے۔“

”ہاں“ سلطان نے کہا۔ ”میں اسی خطرے سے چوکنار رہنا چاہتا ہوں۔“

✱

اُس دور کے کسی قلعہ نگار کا حوالہ دیتے ہوئے انگریز تاریخ نویس سمیت لکھا ہے ”محمود غزنوی نے پانچ دیا اور دو عبور کیے اور بازی کے مصافات میں پہنچ گیا۔“

اُس کی پکار اور لٹکار میں اسے جان بچا۔ اُسے روک لیا گیا۔ سلطان اور سالار وہیں تھے۔ سوار اُن کے سامنے آیا تو مظلوم ہوا کہ وہ اُن آٹھ آدمیوں میں سے تھا جو کسی کو بتائے بغیر دریا میں اُتر گئے تھے۔ وہ کمانداری کے عہدے کا آدمی تھا۔ اُس نے جوابات بتائی اُسے سلطان محمود تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا۔ ہوا یوں تھا کہ ان چار کمانداروں کو ایک جاسوس سے پتہ چلا کہ لاہور کی فوج دیا کے پار کنارے سے اڑھائی تین میل کے فاصلے پر خیمہ زن ہے اور گہری نیند سوئی ہوئی ہے۔ اس کماندار نے اپنے تین ساتھی کمانداروں کو ساتھ لیا۔ چار پہاڑی بھی ساتھ ہو گئے اور وہ جوش میں آکر دریا پار کر گئے۔ انہوں نے جاسوس کو راہنمائی کے لیے ساتھ لے لیا تھا۔ انہوں نے دشمن کے کیمپ پر جا چھاپہ

ملا۔ ”کچھ نہ سوچیں سلطان عالی مقام!“ اُس نے کہا۔ ”فورا دریا پار کریں۔ دشمن آپ کے قدموں میں پڑا ہے۔“

سلطان محمود نے سالار محمد الطائی کو اجازت دے دی کہ وہ حملہ کرے کماندار نے انہیں بتایا کہ دشمن کی نفری اور کیفیت کیا ہے اور کتنی نفری سے حملہ کیا جائے۔ فوراً تین چار گھوڑ سوار سے تیار کر کے دریا پار کیا گیا۔ کماندار راہنمائی کر رہا تھا۔ دریا پار کر کے یہ دستے آگے گئے۔ دشمن کی خیمہ گاہ سے شعلہ اُٹھ رہے تھے وہاں قیامت کی افزائش مچی ہوئی تھی۔ گھوڑے خستوں سے ڈر کر بے قابو ہو رہے تھے۔

اس کیفیت میں سالار ابو عبد اللہ محمد الطائی نے سوار دستوں کو حملے کا حکم دے دیا۔ دشمن سوائے بھاگنے کے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا تعاقب کیا گیا لیکن ایک ایک آدمی کا تعاقب نہیں تھا۔ جو سامنے آیا وہ ہلاک ہوا۔ کچھ لپٹ یا بیٹھ گئے۔ جس تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ صبح کے اجالے میں خیمہ گاہ کا منظر بُرا ہی بھیا تک نظر آیا۔ جگہ جگہ سے دھواں اُٹھ رہا تھا اور لاشیں ہی لاشیں تھیں اور زخمی بُری طرح کڑا رہے تھے۔ بہت سے ہندو سپاہی مار کر بیٹھ گئے تھے۔

چند ایک آدمیوں سے کہا گیا کہ وہ ٹیکیز دل پر دریا کے پار جائیں اور انہیں پکڑنے کی کوشش کریں اور اگر کوئی زیادہ گڑبڑ ہو تو وہیں سے آواز دیں تاکہ اُن کی مدد کو مزید آدمی بھیجے جائیں۔

ایک تو رات کا وقت تھا، دوسرے سردی کا موسم تھا۔ بچ پانی میں تیرنا بہت ہی مشکل تھا لیکن بارہ چودہ رضا کار ٹیکیزوں پر دریا میں اُتر گئے۔ صرف ایک سہولت تھی۔ موسم سرما کی وجہ سے دریا میں پانی کم تھا اور اس میں برسات کے موسم والا اندر نہیں تھا۔ جب یہ کماندار اور سپاہی رضا کارانہ طور پر دریا میں اُترے تو دریا پار سے شور سنائی دینے لگا اور اُس طرف آسمان لال ہونے لگا جیسے کہیں آگ لگی ہو۔

”وہ کماندار کون کون تھے جو پہلے دریا کے پار گئے ہیں؟“ سالار محمد الطائی نے پوچھا۔

انے نام بتانے گئے۔

”سلطان!“ سالار نے سلطان محمود سے کہا۔ ”یہ چاروں بھگور بے نہیں ہو سکتے۔ معاملہ کچھ اور ہے۔ ان چاروں کو میں ذاتی طور پر جانتا ہوں یہ چاروں خطرناک حد تک جوشیلے ہیں۔ انہوں نے دشمن کی کسی خیمہ گاہ پر بخون مارا ہے۔ مجھے اجازت دیں کہ دو دستے لے کر پار چلا جاؤں۔“

”لیکن کچھ پتہ تو چلے کہ وہاں کون ہے، کیا ہے؟“ سلطان محمود نے کہا۔

”تم دستے تیار کر لو۔“

دریا پار کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔ اندازے کے مطابق وہ جگہ کم دیش تین میل دور تھی۔ رات کی خاموشی میں آوازیں بہت دبی دبی کی تھیں۔ خاصا وقت گزر جانے کے بعد ایک گھوڑ سوار دریا سے نکلا۔ اُس نے گھوڑے کی پیٹھ پر دریا پار کیا تھا لہذا دھیرے میں وہ چلتا آ رہا تھا۔ ”سلطان کہاں ہیں؟ سالار کہاں ہیں؟... تیار ہو جاؤ۔ حملے کے لیے... سلطان کہاں ہوں گے؟“

کی قریب کاری پر زیادہ فائدہ تھا۔ وہ غزنی کا ہاتھ بٹھار ہوتے ہوئے دوسرے
مدار جول کو غزنی کے خلاف متحد کر رہا تھا اور خود غزنی کی فوج پر عقب سے حملہ
کرنے کے لیے اپنی فوج کو جنگل میں چھپانے ہوئے تھا۔

اُس رات یوں ہوا کہ غزنی کے ایک جاسوس نے پتہ چلا دیا تھا تلوچن پال
کی فوج غلاں جگہ اسی شاہنچی ہے۔ تیس سہی تھا کہ وہ عقب سے غزنی کی فوج
پر حملہ کرے گی۔ جاسوس نے دریا تیر کر پار کیا۔ اتفاق سے ایک کماندار جو اس جاسوس
کو جانتا تھا، کمانڈر سے پرکھتا تھا۔ جاسوس نے اُسے بڑی خوشی سے بتایا کہ وہ
یہ کارنامہ کر کے آیا ہے کہ اُس نے لاہور کی فوج کا پتہ چلا دیا ہے۔ یہ کماندار
اُٹھا۔ اُس نے اپنے تین ساتھی کمانداروں سے بات کی۔ وہ تیار ہو گئے اور
چار سپاہی بھی تیار ہو گئے۔ انہوں نے جاسوس سے کہا کہ وہ ان کے ساتھ چلے۔
جاسوس کو سلطان محمد کے پاس جانا اور رپورٹ دینی تھی لیکن یہ جو شیلے کماندار
اُسے اپنے ساتھ لے گئے۔

چاروں کماندار شب خون مارنے کی مارت رکھتے تھے۔ وہ تلوچن پال کی خیمہ گاہ
تک پہنچ گئے۔ پہلے انہوں نے دو ستر یوں کو ہلاک کیا، پھر ایک خیمے کو آگ لگائی۔ اس
کے شعلوں سے انہوں نے کچلے جلانے اور کئی خیموں پر پھینک دیے۔ ان میں سے
دو نے سکیم کے مطابق بہت سے گھوڑے کھول دیے اور چند ایک گھوڑوں کو خیر
مدد سے۔ یہ گھوڑے بیک کر بھاگے تو دوسرے گھوڑے بھی ڈر کر ادھر ادھر بھاگنے
لگے۔

خیمہ گاہ گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ فوج ہڑ ہڑا کر اٹھی۔ ظاہر ہے فوج
کو یہ سمجھنے میں خاصا وقت لگا ہو گا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد خیمہ گاہ
میں آگ ہی آگ تھی۔ زیادہ مدد تیز ہوانے کی خیمے سے خیر چلا گیا۔ خیمے اس
لیے قریب قریب لگائے گئے تھے کہ دائیں بائیں چٹائیں تھیں۔ آٹھوں جانب
چٹانوں پر چڑھ گئے اس مقصد کے لیے وہ تیر کمانیں ساتھ لائے تھے۔ انہوں
نے اُپر سے اندھا دھند تیر برسانے شروع کر دیے۔

ان سے پتہ چلا کہ یہ لاہور کی فوج تھی اور ہمارا جہ تلوچن پال میں تھا سلطان
اسی سے پریشان تھا کہ وہ کہاں ہے۔ وہ شام کے وقت فوج کو کہیں سے لاہور اور
میان خیمہ زن ہوا تھا۔ یہ کہی کو بھی معلوم نہ تھا کہ اُس کا ارادہ اور منصوبہ کیا تھا سلطان
کی فوج کے اتنی قریب آنے سے یہی کہا جاسکتا تھا کہ سلطان محمود سائے کی فوج
سے لڑ رہا ہوتا تو تلوچن پال پیچھے سے حملہ کر دیتا۔

اب تلوچن پال وہاں نہیں تھا۔ اس کے اعلیٰ کمانڈر بھی بھاگ گئے تھے
اور وہ اپنا بیشتر غنائ بھی چھوڑ گیا تھا۔ اُس کی فوج ختم ہو چکی تھی اور یہ خطرہ
ختم ہو گیا تھا کہ غزنی کی فوج پر عقب سے حملہ ہو گا۔

یہ واقعہ تقریباً تمام سورتوں نے لکھا ہے۔ فرشتہ نے ان آٹھ آدمیوں کے متعلق
لکھا ہے کہ وہ سلطان کے باڈی گارڈ تھے لیکن سورتوں کی اکثریت نے انہیں باڈی
گارڈ نہیں کہا۔ انہیں آٹھ جو شیلے کماندار اور سپاہی کہا ہے۔ انگریز سورتھ دی۔
اسے سمجھنے لکھا ہے تلوچن پال دریائے رام گنگا (جو چھوٹا دریا ہے) کے
پار پیچھے ہٹ گیا۔ محمود کے آٹھ افسروں نے جوش اور عتاب کے زیر اثر شکیلوں
پرستہ کر دیا پار کیا اور تلوچن پال کی فوج کو ایسا بکھیرا کہ وہ فوراً اکٹھی ہو کر لڑنے کے
قابل نہ رہی۔

بے شک یہ بے مثال بہادری تھی کہ صرف آٹھ آدمیوں نے کم دیش میں ہزار
فوج کی خیمہ گاہ پر ایسا ٹھون مارا کہ اُسے تباہ و برباد کر دیا مگر سلطان محمود نے انہیں
خراج تحسین پیش کر کے انہیں سرتش کی کمانوں نے یہ کارروائی کبھی کے حکم کے
بیکر کی۔ ان چار کمانداروں نے جو بیان دیا وہ اُس دور کے کاغذات میں فارسی
کے کچھے کچھے الفاظ کی صورت میں محفوظ ہے۔

انہوں نے کہا کہ سلطان محمود بار بار لاہور کی فوج کے خطرے کا اظہار کرتا
تھا۔ اس کے علاوہ ان میں اس حادثے کے قہر بھریا تھا کہ باری میں ہندوؤں
نے غزنی کے چند ایک کمانداروں اور عہدیداروں کو قتل کر دیا ہے۔ انہیں تلوچن پال

ہے۔ ان گاڑی بانوں میں سے دو کو بھیج دو تاکہ ہمارا جہ کی خروج کے ساتھ رابطہ ہو جائے۔ باقی کام لڑائی شروع ہوتے ہی کریں گے۔
 ”میں نے سب کو خبردار کر دیا ہے۔ ایک آدمی نے کہا۔
 ”میں ہمیشہ کے لیے تمہاری ہوں۔“ عورت نے کہا۔ ”اُسے تو بڑے نام خاوند بنا رکھا ہے۔“

کوئی آ رہا تھا۔ اس عورت کے ساتھ جو آدمی تھا، وہ جلدی سے کھسک گیا۔ عینبرین بھی وہاں سے ہٹ آئی لیکن اُس نے نظر کھٹی کہ وہ عورت بدھر جاتی ہے۔ وہ ادھر ہی آ رہی تھی جہاں عورتوں کے خیمے تھے۔ عینبرین ایک جھاڑی کے نیچے بیٹھ گئی۔ وہ عورت قریب آئی تو عینبرین اُٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ اس عورت کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔

”دو شین؟“ عینبرین نے اُسے چاندنی میں پہناتے ہوئے کہا۔ ”شاید مجھے غلطی لگ رہی ہے۔“

”عینبرین جو تم!“ دو شین نے کہا۔ ”تم یہاں؟ کس کے ساتھ آئی ہو؟ اُس کے ساتھ آئی ہوگی جس کے ساتھ بھاگتیں۔“

”تم بھی تو بھاگ کر آئی ہوگی۔“ عینبرین نے کہا۔ ”کسی ایک خالی لڑکی کا غزنی کی فوج کے ساتھ ہونا حیران کن لگتا ہے۔ کون ہے تمہارا خاوند؟“
 ”رجب بانجان!“ دو شین نے کہا۔ ”کماذرا ہے۔“

”رجب بھوئی کون؟“ عینبرین نے کہا۔ ”میں اُسے جانتی ہوں۔ اُس سے مل کے آ رہی ہو؟“

”میں کسی سے بھی مل کے نہیں آ رہی۔“ دو شین نے کہا۔

عینبرین ہنس پڑی اور ہولی۔ ”میں جانتی ہوں وہ رجب نہیں تھا۔ آج کوئی ابھی کماذرا ادھر نہیں آ سکتا۔ میرا خاوند بھی کماذرا ہے۔ وہ بھی نہیں آ سکتا۔۔۔۔۔ دو شین! ذرا ہوش سے اور اپنی نیت ٹھکانے رکھ کے یہاں رہو۔“

ایک کماذرا کو خیال آگیا کہ اپنی فوج آجانے تو تروچن پال کی فوج کو مکمل طور پر ختم کیا جاسکتا ہے۔ وہ اپنے ساتھیوں کو بنا کر جانوں سے اترتا۔ وہاں بے شمار گھوڑے ادھر ادھر دھندھے تھے کچھ دُور جا کر کھڑے ہو گئے تھے۔ کماذرا نے ایک گھوڑے کو پکڑا اور اس کی نیکی پیٹھ پر سوار ہو کر دریا کی طرف گھوڑے کو دوڑا دیا۔

لاہور کی فوج تو ختم ہو گئی لیکن تروچن پال نکل بھاگا۔

✱

کالنج کامارا جہ گنڈہ اپنی فوج کے کالنج سے چل پڑا تھا۔ اس کی اطلاع سلطان محمود تک پہنچ گئی۔ اُس نے اپنی فوج کو کوہج کا حکم دے دیا۔ وہ تنوج سے چلا تھا اور اس کا رخ کالنج کی طرف تھا۔ راستے میں اُسے اطلاع ملی کہ گنڈہ کی فوج دریائے جہنا پد کر آئی ہے۔ سلطان محمود نے راستے میں دو پڑاؤ کیے اور تقریباً ایک سو میل فاصلہ طے کر گیا۔ اس سے بیس بائیس میل آگے الا آباد ہے جہاں دریائے گنگا اور جہنا مل کر ایک دریا ہو جاتے ہیں۔ گنڈہ کی فوج بڑھی آ رہی تھی اور غزنی کی فوج سے تین چار میل دُور رک گئی۔

یہاں آکر سلطان محمود کا وہ دشمن بیدار ہونے لگا جو اُس کے ساتھ غزنی سے آیا تھا۔ یہ عورتیں تھیں جو فوج کے ساتھ تھیں! پہلے وہ اس طرح الگ الگ تھیں کہ کسی عورتیں ایک دوسری کو دیکھ بھی نہ سکیں کہ کون کون ساتھ آئی ہے۔

رات کا وقت تھا۔ عینبرین اپنے خیمے سے نکلی اور ٹیٹے ٹیٹے ذرا پرے نکل گئی۔ اُسے کھسکھسیر سانی دی۔ رات چاندنی تھی۔ اُسے کچھ شک سا ہوا۔ وہ دیکھ پاؤں چھپ چھپ کر آگے بڑھی۔ اُسے ایک عورت کی آواز سانی رہیے لگی جو بڑی صاف تھی۔

”اچھا زیادہ انتظار میں کیا چاہیے۔“ عورت بڑھ رہی تھی۔ ”لاہور کی فوج تو دھوکے میں آ گئی ہے۔ اب تم بتاتے ہو کہ ایک ہمارا جہ کی فوج آ رہی

دو شین نے پیک کر غزین کو گھٹے لگالیا اور بنسنے لگی۔ پھر برلی۔ تم ٹھیک کہتی ہو۔ وہ جب نہیں تھا۔ وہ اس کا دوست تھا۔ رجب کا پیغام لایا تھا۔۔۔ تم مجھ پر کچھ شک کر رہی ہو۔ میں سلطنت غزنی کی وفادار ہوں۔ اگر نہ ہو تو یہیں کیوں آتی؟ کچھ تم اپنے جیسا سمجھو۔ تم غزنی کی فوج کی سلامتی اور فتح کی دعا کیا کرتی ہونا۔ میں دن رات دعا کرتی ہوں۔ اور وہ ہستی ہوئی چلی گئی۔

غزین وہیں کھڑی گہری سونچ میں کھو گئی۔

سلطان محمود بہاراج گندہ کی فوج کا جائزہ لینے کے لیے خود آگے گیا۔ اس کے ساتھ سالار محمد الطائی تھا۔ وہ گھوڑے سے اتر کر ایک اور نئے درخت پر چڑھ گیا۔ اس نے بہاراج گندہ کی فوج دیکھی تو اس کی آنکھیں کھٹکتیں۔ یوں جن میں گردیزی، ابن الاثیر اور فرخی قابل ذکر ہیں، لکھتے ہیں کہ سلطان محمود نے بلند جگہ سے سامنے دیکھا تو وہ اپنی گھبراہٹ کو چھپانہ سکا۔ جہاں تک نظر جاتی تھی فوج کے خیمے، گھوڑے، ہاتھی اور ہندو فوجی نظر آتے تھے۔ دور دور تک زمین کھدی ہوئی تھی۔ یہ خندقیں تھیں۔ ابوالقاسم فرشتہ نے بھی سلطان محمود کے اسی رد عمل کی گواہی دی ہے۔

اپنی سوزخوں میں سے بعض نے اس وقت کی تحریروں کے حوالے سے لکھا ہے کہ محمود غزنوی نے اپنے سالار ابو عبد اللہ محمد الطائی سے کہا کہ مجھے دشمن ملک کے اندر اتنی دور تک نہیں آنا چاہئے تھا۔ تم کہہاں سے آئے گی، پسپائی کی صورت میں ہم کہاں جائیں گے، دشمن ہمیں واپس قنوج کے قلعے تک نہیں پہنچنے دے گا۔ ہم قلعہ بند ہو کر ہی لڑ سکتے ہیں۔

”جس نے سلطان محمود کی زبان سے پسپائی کا لفظ پہلی بار سنا ہے“

سالار محمد الطائی نے سلطان محمود سے کہا۔ ”دشمن کی طاقت بہت زیادہ ہے۔ پھر بھی ہمیں پسپائی کی نہیں سوچنی چاہیے۔“

”اتنی ہی فوج گوالیار کی ہے جو ابھی پہنچی نہیں۔“ سلطان محمود نے کہا۔ ”وہ بھی آگئی تو کیا ہوگا؟“ وہ بولتے بولتے چپ ہو گیا اور سر کو ہلکا سا

جھکا دے کر بولا۔ ”اللہ مجھے مدد کرے۔۔۔ اللہ مجھے مدد کرے۔۔۔“

میں اللہ کی ذات کو بھول گیا تھا۔

وہ شخص کے وقت جس طرح کیا کرتا تھا اسی طرح درخت سے اُترا۔ قبلہ ہو کے دو رکعت نفل ادا کئے۔ اس کے ساتھ جو سالار اور دیگر افراد تھے، انہوں نے بھی نفل ادا کئے، اور سلطان واپس اپنے کیمپ میں آگیا۔

بہاراج گندہ کی فوج کی نفری پچاس ہزار پیادہ چھتیس ہزار گھوڑ سوار اور پچھ سو چالیس جنگی ہاتھی تھے۔ اسے سب سے بڑا یہ فائدہ حاصل تھا کہ وہ اپنے ملک میں تھا اور اس کی ریاست ایک دن کی مسافت پر تھی۔ اس ملک کا بچہ بچہ اس کے ساتھ تھا۔ سلطان محمود کو اپنے اللہ پر بھروسہ تھا۔

سلطان نے اپنے کیمپ میں جا کر تمام کمانڈروں اور ان سے بھی کمر عہدیداروں کو اکٹھا کیا اور ان سے کہا۔ ”تم نے کسی بھی میدان میں مجھے واپس نہیں کیا۔ تم نے انتہائی مشکل حالات میں بھی دشمن کو شکست دی ہے۔ تم نے دشمن کی طاقت کے دشمن سے بھی ہتھیار ڈالوائے ہیں مگر آج ہمارے سامنے پہاڑ آن کھڑے ہوئے ہیں۔ میں ایسا حکم نہیں دے سکتا کہ ایک آدمی بارہ آدمیوں سے لڑے اور انسان ہاتھوں سے ٹکرا جائیں۔ میں نہیں یہ یاد دلانا چاہتا ہوں کہ تم یہاں کیا مقصد لے کر آئے ہو۔ میں نہیں یہ بھی یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ہم اگر لڑ گئے تو ہم بھاگ کر کہیں بھی نہیں جاسکیں گے۔ ہم میں سے بعض مائے جاہلیں گے اور بعض ہندوؤں کے قیدی ہوں گے۔ ہندو غزنی کے قیدیوں سے اپنی ہر ایک شکست کا انتقام لے گا۔ اپنے بھائیوں کی توہین کا انتقام لے گا اور سب سے بڑا نقصان اسلام کو پہنچے گا۔ ہندو بہاراجے غزنی پر چڑھ رہے ہیں۔ تم نہ ہوئے تو انہیں روکنے والا کوئی نہ ہوگا۔ بہاراج ملک ان کا ہو گا۔ ہماری بیٹیاں ان کی ہونگی اور ہندو سلطنت غزنی کو جو اسلام کا مرکز ہے، بت خانہ بنادیں گے۔ آگے یہودی اور نصرانی ہیں جو پہلے ہی ہمارے مسلمان امراء اور حکمرانوں کو دیر در مدد دے کر ہماری جڑیں کھدکھلی کر رہے ہیں۔ اگر ہندو مائے

رات کا وقت تھا۔ غنبرین جیسے میں اکیلے تھی۔ ملازم اندر آیا اور اسے بتایا کہ دوشین کو اُس نے جاتے دیکھا ہے اور اُنسی طرف اُس نے دو گاڑی بالوں کو بھی جاتے دیکھا ہے۔ غنبرین جیسے سے نکل گئی اور اُس طرف چل پڑی۔ ہر صبح ملازم نے بتایا تھا کہ دوشین گئی ہے۔ غنبرین چھپ چھپ کر اور زار زار سے بدل کر جا رہی تھی۔ اسے بڑی اچھی اوٹ مل گئی۔ اس سے ذرا پرے چار آدمی کھڑے تھے اور ان کے ساتھ نہ صرف دوشین تھی بلکہ ایک اور عورت بھی تھی۔ غنبرین پاؤں کے بل سرکتی اور آگے چلی گئی اور اسے باتیں سنائی دینے لگیں۔ ان کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ کرنا چاہتے ہیں اُس کی بات ہو چکی ہے۔ غنبرین کو آخری بات سنائی دی۔

”کشتی کنارے پر بندھی ہے۔“ ایک آدمی کہہ رہا تھا۔ اسے آواز نکالے بغیر کشتی تک پہنچا اور کشتی میں سوار ہو کر رستہ کھول دینا۔ پانی کا سہارا دھڑک رہی ہے۔ چپو دوڑ جا کر مارا۔ سنتری اُدھر بھی چلے جایا کرتے ہیں۔ فاصلہ زیادہ نہیں۔ دو ساعت میں پہنچ جاؤ گے.... پھر سن لو۔ ہمارا جہ سے کہنا کہ سوار دھڑک رہا ہے بالیں پیلو پر لائے۔ تم نے راستہ دیکھ لیا ہے۔ وہ اُسے سمجھا دینا۔ میں اُدھر ہی ہوں گا۔ ہمارا جہ سے کہنا کہ دلوں ہماری طرف سے کوئی مقابلہ نہیں ہوگا۔ تمہیں تلب تک راستہ مل جائے گا۔ اگر ہمیں موقع مل گیا تو سلطان ہمارے رستے سے مرچکا ہوگا۔ ہمارا جہ کو ہمارے پیلو تک کا راستہ اچھی طرح سمجھا دینا اور اُسے بتانا کہ ہماری فوج اُس کی نواح پر حملہ کر کے پیچھے ہٹے گی۔ ہم لوگ اسے پسپائی نہ کچھ لینا اور پیچھے نہ آجانا۔ نہ دانیس بالیں سے مارے جاؤ گے۔ ہمارا حملہ آور دستہ پیچھے ہٹے تو ہم بھی پیچھے چلے جانا۔ کہیں ہمارے سلطان کے پھندے میں نہ آجانا.... جاؤ نکل جاؤ۔ تمہارا انعام ہمیں معلوم ہے کیا ہے۔“

وہ آدمی دریا کی طرف چلے گئے اور باقی دوشین اور دوسری عورت کو ساتھ لے کر کسی اور طرف چلے گئے۔ غنبرین اوٹ سے اٹھی اور تیز قدم اپنے خیمے تک آئی۔ کمان اور ترکش اٹھایا اور منجر کمر میں اُڑا۔ اُس نے ملازم

ملک میں پہنچ گئے تو تمام کفار متحد ہو کر خانہ کعبہ تک پہنچ جائیں گے، پھر ہم سب اللہ کے حضور دُویا ہ پیش ہوں گے.... آج ہمیں اللہ کے حکم سے لڑنا ہے۔ اللہ کا نام زبان پر لے کر لڑنا ہے۔“

اس کے بعد سلطان محمود نے دستوں کی تقسیم بنائی اور انہیں بتایا کہ کون سا دستہ کہاں ہوگا اور اسے کیا کرنا ہے۔ اُسے فوجی حرب و ضرب اور جنگی چالوں کا کمال دکھانا تھا اور نہ وہ اتنے طاقتور دشمن کو شکست نہیں دے سکتا تھا۔ راتیں طرف دریا نے جہاں اور بائیں طرف دیانے لگنا تھا۔ دونوں دریاؤں کے درمیان کہیں فاصلہ میں میل تھا کہیں چالیس میل سلطان محمود اس کوشش میں تھا کہ گنڈہ کی فوج کو دو حصوں میں کاٹ دے اور انہیں دریاؤں تک لے جائے لیکن یہ ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ اُس نے بہر حال دستوں کو تقسیم کر کے ضروری ہدایات دے دیں اور انہیں کہا کہ وہ پانچویں تک اُس کا پیغام پہنچا دیں۔

✱

غنبرین نے دوشین کا خیمہ دیکھ لیا تھا۔ اُسے پختہ شک ہو گیا تھا کہ دوشین صرف اپنے خاندان کو دھوکہ نہیں دے رہی بلکہ سلطان محمود کے لیے دھوکہ بن کر آئی ہے۔ غنبرین کو اُنسی سزا اس کے خاندان نے بتایا تھا کہ سلطان محمود نے کمانداروں سے کیا کہا ہے اور یہ بھی کہ دشمن کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اُس نے غنبرین سے کہا تھا کہ وہ دعا کرے۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا تھا۔

غنبرین نے اپنے خاندان کو عزیزی کو نہیں بتایا تھا کہ یہاں ایک ایلیک خانی لڑکی ہے جو ایک سلجوقی کماندار کی بیوی بن کر آئی ہے۔ وہ دوشین کو اچھی طرح جانتی تھی۔ اُس کے خیالات سے بھی واقف تھی۔ وہ مان ہی نہیں سکتی تھی کہ دوشین اور اُس کا سلجوقی خاندان غزنی کے وفادار ہو سکتے ہیں۔ دوشین کو خدا نے جتنا جتن دیا تھا۔ اُس نے اتنی ہی ٹیٹھانیت اپنی فطرت میں بھر لی تھی۔ چنانچہ غنبرین اسے چھپ چھپ کر دیکھتی رہتی تھی۔ اُس نے اپنے ملازم سے بھی کہہ دیا تھا کہ وہ اُس لڑکی پر نظر رکھے۔

سے کہا کہ وہ برہمی اور تلوار لے کر اُس کے ساتھ چلے۔

✱

عزیزین نام تجرہ کار تھی۔ اُس پر جذبات کا غلبہ تھا۔ وہ یہ تو سمجھ گئی تھی کہ سلطان محمود تاریخ کے بہت بُرے دھوکے کا شکار ہو رہا ہے لیکن اُسے صحیح طریقے سے کارروائی کرنے کی سوجھ بوجھ نہیں تھی۔ سلطان محمود سے اس کی

حقیقت مندی کا یہ عالم تھا کہ اُس پر دیوانگی طاری ہو گئی اور ملازم کو ساتھ لے کر دریا کی طرف دوڑ پڑی۔ دریا دُور نہیں تھا۔ وہ دیکھ نہ سکی کہ اُس کے نقاب میں کوئی آ رہا ہے۔ وہ کنارے سے کشتی بٹھنے سے پہلے دریا تک پہنچنے کی کوشش میں تھی۔

وہ پہنچ گئی۔ چاندنی شفاف تھی۔ کشتی کنارے سے ہٹ گئی تھی۔ وہ ادر آگے چلی گئی اور ایک گھنٹہ زمین پر رکھ کر اُس نے ایک تیر چلایا۔ فوراً بعد دوسرا چلایا۔ اس کے ساتھ ہی اُسے اپنے پیچھے شور مچاتا دیا۔ وہ اٹھی اور پیچھے دیکھا۔ اُس کے ملازم پر دو آدمیوں نے حملہ کر دیا تھا۔ ان میں سے ایک آدمی عزیزین کی طرف دوڑتا تو ملازم اسے برہمی سے روکتا تھا۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں تلواریں تھیں۔ ملازم لڑتا تو رہتا تھا لیکن اس کا مقابلہ دو فوجیوں کے ساتھ تھا۔ ملازم زخمی ہو گیا۔

ان دونوں آدمیوں نے عزیزین اور اُس کے ملازم کو دریا کی طرف جاتے دیکھ لیا تھا۔ وہ انہیں وہیں ختم کرنے کے لیے ان کے پیچھے چلے گئے تھے۔ ان کے لیے یہ زندگی اور موت کا سوہا تھا۔

ایک آدمی نے عزیزین پر حملہ کیا۔ وہ تلوار کا مار بجا گئی۔ اس آدمی نے دوسرا وار کیا۔ عزیزین نے یہ وار بھی خطا کروا اور اس کے ساتھ ہی اس نے چلانا شروع کر دیا۔ ”آؤ آؤ۔ دینا کی طرف آؤ۔“ اب اس پر حملہ کرنے والا بھر کر اس پر آیا لیکن عزیزین پیچھے کو اٹنے پاؤں دوڑی اور اُس نے کنارے میں تیر ڈال لیا۔ اس آدمی کو وہ زندہ پکڑوانا چاہتی تھی۔

”کہان سے تیر نکال لے لڑکی!۔ اس کے حملہ آور نے کہا۔ ہم سبھے پھوڑ دیں گے۔“

عزیزین تیر انداز تھی۔ اُس نے کہان ادر کر کے پہنچی تو وہ آدمی بوکھلا کر دوڑ پڑا۔ عزیزین نے تیر پھوڑ دیا جو اس آدمی کی ران سے پار ہو گیا۔ ناصہ بہت تھوڑا تھا۔ دوسرا آدمی زخمی ملازم کو مارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ عزیزین نے اُس کی ٹھکی ٹانگوں کا نشانہ لے کر تیر پھوڑ دیا۔ تیر اُس کے گولہ میں اتر گیا۔

وہ دونوں دُورے لیکن ٹانگوں میں تیر اترے ہوئے تھے۔ وہ دُور نہ جا سکے۔ عزیزین کے مسلسل شور پر گشت کے سنتری دُورے آئے۔ عزیزین نے انہیں کہا کہ دریا میں ایک کشتی جا رہی ہے اُسے پکڑو۔ ہندوؤں کے جاسوس جا رہے ہیں۔ سنتریوں نے بڑی جی بلند آواز سے کمی کو پکارا۔ دُور اسی دیر میں چار یا پنج فوجی آ گئے۔ عزیزین نے انہیں بتایا کہ کشتی میں دونوں آدمی اس کے تیروں سے زخمی ہیں۔

دو سنتری کنارے کنارے دُورے۔ کشتی کنارے کے ساتھ ساتھ ہی جا رہی تھی۔ کشتی میں بیٹھے ہوئے دونوں آدمیوں کے جسموں میں تیر اترے ہوئے تھے۔ وہ کشتی کو دُور لے جانے کے قابل نہیں تھے۔ سنتری دریا میں اتر گئے اور کشتی کو کنارے پر لے آئے کشتی میں دونوں آدمی زندہ تھے۔ باہر جو آدمی عزیزین کے تیروں سے زخمی ہوئے تھے، انہیں بھی پکڑ لیا گیا۔ سنتری یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ دونوں ان کی اپنی فوج کے کماندار تھے۔

سب کو اسی وقت سالار محمد الطائی کے پاس لے گئے۔ کشتی میں جو جا رہے تھے وہ ہندو تھے جو اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کر کے سلجوقیوں کے ساتھ آئے تھے۔ سالار محمد الطائی ان سب کو سلطان محمود کے سامنے لے گیا۔ ہندو ابھی زندہ تھے اور ہوش میں تھے۔ دونوں کمانداروں رجب بائیجان اور فرید مرقد کی ٹانگوں میں تیر اترے ہوئے تھے۔ سلطان محمود نے کہا کہ جب تک یہ بیچ نہ بولیں ان کے جسموں سے تیر نہ نکالے جائیں۔

راجہ ہائی پر کسی بھی ایک بنا ہی آئے گی۔ آپ کا جواب نفی میں آیا تو میں آپ پر حملہ کر دوں گا اور اُدھر آپ کی راجہ ہائی محاصرے میں آجائے گی۔ میں کافی فوج بھیج چکا ہوں۔ امید ہے آپ میرے ہاتھوں اپنی فوج کا قتل عام نہیں ہونے دیں گے اور کالنجور اور اس کے مندروں کو جلے ہوئے کھنڈر بننے سے بچالیں گے۔

ماراج گنڈہ نے سلطان کے اٹلی کو عزت سے رخصت کیا لیکن اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اُس پر خوف غاری ہو گیا تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اُس نے غزنی کی فوج کی خیمہ گاہ کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ اُس نے ہراول و ستے روانہ کیے سلطان محمود کے دیکھ بھال کے آدمیوں نے فوراً سلطان کو اطلاع دی سلطان نے سالار محمد لطائی سے کہا کہ وہ ہندوؤں کے ہراول پر ایسا حملہ کرے کہ ان کی ساری فوج پر دہشت طاری ہو جائے۔

سالار محمد لطائی نے میدان جنگ میں عمر گزار دی تھی قبل از وقت اطلاع ملنے سے اُس نے اپنے دو سوار دستے سامنے کی بجائے واپس بائیں ہضم کر دیئے اور کمان اپنے ہاتھ میں رکھی۔ جب ماراج گنڈہ کا ہراول آگے آیا تو دونوں طرف سے گھوڑ سواروں نے اُس پر حملہ کر دیا۔ سالار محمد لطائی نے بڑا ہی شدید حملہ کرایا۔ گنڈہ کے ہراول کا حال بہت بُرا کر دیا گیا۔ جو ہندو واپس زندہ پہنچ گئے انہوں نے ساری فوج میں دہشت پھیلا دی۔

اُس روز اور کوئی لڑائی نہ ہوئی۔ رات کو سلطان محمود پھر خدا کے حضور رکوع و سجود کرنے لگا۔ اُسے توقع تھی کہ ماراج گنڈہ رات کو حملہ کر دے گا مگر کچھ بھی نہ ہوا اور صبح ہو گئی۔ سلطان سناڑ سے فارغ ہوا تو سالار محمد لطائی نے اُس کے خیمے میں آکر یہ عجیب خبر سنائی کہ ماراج گنڈہ کی فوج اتر کی حالت میں رات کو جانے کہاں چلی گئی ہے۔ سالار کو دیکھ بھال کرنے والوں نے بتایا تھا۔

”یہ دھوکہ ہے۔“ سلطان محمود نے کہا۔ ”اتنا طاقتور دشمن بغیر لڑے

سب سے پہلے ہندو بولے اور انہوں نے بتا دیا کہ وہ ہندو میں اور سلجوتی کا غدار انہیں مسلمانوں کے بہرہ پر میں ساتھ لائے تھے اور اب وہ ماراج گنڈہ کے پاس جا رہے تھے۔ انہوں نے ساری بات بتا دی۔ دونوں سلجوتی کماندروں نے بھی جرم کا اعتراف کر لیا۔ جب انہوں نے بتا دیا کہ انہوں نے اسرائیل سلجوتی کے منصوبے پر عمل کیا ہے تو سلطان محمود کے چہرے پر قہر اُتر آیا۔

”اگر ہم خیریت سے واپس چلے گئے تو سب سے پہلے اسرائیل سلجوتی اور اس کے دست راست ایلیکین کو ٹھکانے لگاؤں گا۔“ سلطان محمود نے کہا۔

سلطان نے دشمن اور اُس کی ساتھی لڑکی کو بھی گرفتار کرنے کا حکم دے دیا اور اُن تمام سلجوتیوں سے ہتھیار لے کر انہیں نہتہ کر دیا جو اس کی فوج میں تھے۔ ان سب کو الگ کر کے ان پر پہرہ کھڑا کر دیا گیا۔ اب سلطان کسی سلجوتی پر اعتماد کرنے کو تیار نہیں تھا۔

*

سلطان محمود ماراج گنڈہ کی جتنی طاقت دیکھ کر پہلے ہی پریشان تھا اور سوچ سوچ کر اُس کا سر ہلانے لگا تھا۔ اب اُس پر اس سازش کا کھف ہوا تو بہت ہی بے چین ہو گیا۔ وہ قبلہ رو ہو کر نفل پڑھنے لگا اور خدا کے حضور بہت گڑگڑایا۔ مورتج نکھتے ہیں کہ اُسے قرآن پاک سے بہت پیار تھا۔ اُس رات وہ قرآن پاک لکھتے ہیں لے کر گڑگڑانا رہا تھا۔ اُسے اچانک ایک روشنی نظر آئی۔ اُس کا دماغ روشن ہو گیا۔ اُسے خیال آیا کہ گنڈہ کی رنگوں پر حملہ کیا جائے۔ اُس نے اپنے ایک نائب سالار کو اٹلی کی حیثیت سے ماراج گنڈہ کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا:

”آپ کی بھات اور سلامتی اس میں سے کہ آپ اسلام قبول کر لیں۔ اگر آپ نے انکار کیا تو آپ تصور میں نہیں لاسکتے کہ آپ واپس کی فوج اور آپ کی

بھاگ تو نہیں سکتا۔ مہاراج گنڈہ نے نہیں آگے بڑھنے کا موقع دیا ہے اُسے فوج ہے کہ ہم آگے بڑھیں گے تو وہ میری فوج کو پھانس لے گا۔ یہ دھوکہ نہیں تھا محمد فاکم فرشتہ اور دوسرے تمام سوزخوں نے کھلبے کرات کو مہاراج گنڈہ کے دل پر خوف طاری ہو گیا اور وہ محسوس کرنے لگا کہ وہ تباہی کی طرف جا رہا ہے۔ یہ ایک معجزہ تھا اور یہ سلطان محمود کی دعاؤں کا اثر تھا۔ سلطان محمود نے کچھ دستے ساتھ لیے اور مہاراج گنڈہ کی خیمہ گاہ تک گیا۔ وہاں خیمے لگے ہوئے تھے اور فوج جا چکی تھی۔ سلطان اسے گھات بھتا رہا لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔

سلطان محمود کو اطلاع ملی کہ مہاراج گنڈہ کی فوج کا لہجہ کو جا رہی ہے۔ سلطان محمود نے تعاقب کا حکم دے دیا۔ یہ ایک دلیلانہ حکم تھا لیکن سلطان نے ہرا دل کو بہت آگے بھیج دیا تھا تاکہ یہ گھات ہو تو بہت چل جائے مگر کہیں بھی گھات نہیں تھی۔ سلطان محمود دشمن کی فوج تک پہنچ گیا۔ سالار محمد لطیفی نے دیکھا کہ سلطان بہت آگے چلا گیا ہے تو وہ تین چار سو اوستے اپنی کمان میں لے کر سلطان کے پیچھے چلا گیا۔

کسی بھی مورخ نے اس سوال کا جواب نہیں دیا کہ مہاراج گنڈہ کو کیا ہو گیا تھا اور وہ لڑائی سے کیوں منہ موڑ گیا تھا۔ سلطان محمود کے تعاقب سے وہ بھاگ اٹھا۔ یہاں تک کہ اس کی فوج ساز و سامان پیچھے چھوڑ کر بھاگ گئی۔ وہی ایسے تھ اور عطی نے لکھا ہے کہ مہاراج گنڈہ پر غزنی کی فوج کا خوف اتنا زیادہ نہیں تھا۔ اس پر کوئی پُر اثر ساز و سامان خوف طاری ہو گیا تھا جیسے اس پر کسی غیبی قوت کا یا آسیب کا اثر ہو گیا ہو۔ بعض تحریروں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس پر ہڈیانی کیفیت طاری ہو گئی تھی اور اس نے ایسی باتیں کی تھیں کہ اس کے افسر بھاگ اٹھے۔

اسے معجزہ ہی کہا جاسکتا ہے۔ سوزخوں کے مطابق جب سلطان محمود وہاں

آیا تو مہاراج گنڈہ کے چھ سو چالیس ہاتھیوں میں سے پانچ سو اسی سلطان کے پاس تھے۔

خود سلطان محمود پر کچھ ایسی کیفیت طاری ہو گئی کہ اس نے ہندوستان میں اپنی باقاعدہ حکومت قائم کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور غزنی کو واپسی کا حکم دے دیا۔ اس کی واپسی کی وجہ یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ اسے غزنی سے اطلاع ملی تھی کہ سبجی بہت بڑی طاقت بن گئے ہیں اور ہر لمحہ خطرہ ہے کہ وہ غزنی پر حملہ کر دیں گے۔

جتنی فوج ہندوستان کی تھی اس سے زیادہ واپس آئی ہو۔ حالانکہ سلطان محمود کچھ دسے قنوج کے گرد و نواح میں اور لاہور کے قریب بھی چھوڑ آیا تھا یہ علاقے اُس کے ہانگزار تھے۔

”سلطان بغیر اُسے واپس آگیا ہے۔ بہت بوٹ مار کر لایا ہے۔“
 ”لانا ہوتا تو یہ جنگی قیدی کہاں سے لے آتا؟ اسنے زیادہ لایا تھی اور گھوڑے کہاں سے آتے؟“

”لوگوں کے اسنے زیادہ ہجوم میں سے اگر میں سلطان پر تیر چلا دوں اور کہاں پھینک کر ہجوم میں غائب ہو جاؤں تو میں پکڑا نہیں جاؤں گا اور سلطان کا کام بھی تمام ہو جائے گا۔“

”ایکے سلطان کو قتل کر دینے سے کیا حاصل ہوگا؟ اس کی سلطنت ہمارے قبضے میں نہیں آجائے گی۔ اس کے بیٹے جوان ہیں جو جنگی چالوں میں باپ کی طرح دانشمند ہیں۔“

”قتل کی باتیں چھوڑو۔ ہمیں یہ دیکھنے کے لیے بھیجا گیا ہے کہ سلطان محمود کی فوج کو کچھ کراد دیکھتی تعداد واپس آرہی ہے اور اس کی حالت کیا ہے۔“

”اسرائیل سلجونی دھوکے میں شکست کھا گیا تھا۔ اب ایسا نہیں ہوگا۔“

”اپنے آپ کو دھوکے میں نہ رکھو۔ غزنی کی جنگی طاقت ہم سے زیادہ ہے۔“

”ایک سلجونی غزنی کے پانچ فوجیوں پر بھاری ہے۔ میں اب بھی کہتا ہوں کہ

ایکے سلطان محمود کو قتل کر دیا جائے تو اس کی فوج کا حوصلہ ٹوٹ جائے گا۔“

”اور غزنی والوں کی حالت اس فقیر جیسی ہو جائے گی۔ اس آدمی نے ایک

فقیر کی طرف اشارہ کر کے ہنستے ہوئے کہا اور اُس نے فقیر سے کہا۔ ”دھبگاری! اپنے سلطان سے کہہ کر جو دولت ہندوستان سے ٹوٹ کے لایا ہے، اُس میں سے

کچھ تجھے دے دے۔“

فقیر بھٹے پرانے پرانے پہنے، دارھی اور سر پر گرد ڈالے، ایک ہاتھ میں

لاٹھی، دوسرے میں مشکوں اٹھائے ان چاروں کے پاس کھڑا تھا۔

قلعے جو نغروں نے سر کئے

سلطان محمود غزنی
 بہار بگنڈہ کو شکست دے کر وہیں
 غزنی پہنچا تو اُس کے ساتھ کم و بیش
 چھ سو ہاتھی اور ڈیڑھ سو گھوڑے تھے۔ بہاراجوں کی فوجوں کے قیدیوں کی تعداد سات
 سے دس ہزار تک تھی۔ غزنی کے لوگ اپنے فاتح سلطان کے استقبال کے
 لیے شہر سے دُور لکل گئے تھے۔ اُن کے نغروں سے آسمان پھٹا جاتا تھا۔ ٹھکے
 مانے پارہوں کے چہروں پر روئی انگلی تھی جب قیدی لوگوں کے سامنے
 سے گزرے تو لوگوں نے فتح و نصرت کا وہ داد بولا کیا کہ فضا لرزنے لگی۔ لوگ
 ان ہندو قیدیوں پر طنزوں کے تیر برسائے گئے۔ بعض اُن کے قریب جا کر کہتے
 تھے کہ غزنی میں تمہیں سچا خدا ملے گا۔ اس کے آگے بجدہ کرنا۔ تمہارے گناہ
 معاف ہو جائیں گے، مگر ہندو فارسی نہیں سمجھتے تھے۔ وہ خالی خالی نکاہوں
 سے تماشائیوں کو دیکھتے تھے۔ بعض کے ہونٹوں پر ہاری ہوئی مسکراہٹ
 اور بعض کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

ان تماشائیوں میں چار آدمی الگ تھلگ کھڑے اپنے سامنے سے گزرتے
 ہوئے سلطان محمود کو دیکھ رہے تھے۔ وہ کوئی نمبر نہیں لگا رہے تھے۔ اُن
 کے چہروں پر سنجیدگی طاری تھی۔ اُن کے سامنے سے سلطان محمود گزر گیا تو وہ فوج کو
 گہری نظروں سے دیکھنے لگے۔ اب کے چونکہ بہار بے مقابلہ سے مُنہ موڑ
 گئے تھے اس لیے سلطان محمود کی فوج کا جانی نقصان نہیں ہوا تھا۔ لگتا تھا جیسے

”میں غزنوی نہیں سلجوقی ہوں۔“ بھکاری فخر نے کہا۔ ”غزنی والے سلجوقی
فیقروں کو بھیک بھی نہیں دیتے۔“

”اگر تمہاری رگوں میں سلجوقی خون ہوتا تو دنیا میں ڈوب کر مر جاتے، بھیک
نہ مانگتے۔“ ایک نے اسے کہا۔ فوراً یہاں سے نکلو اور وہاں پہنچو جہاں اسرائیل
سلجوقی کی بادشاہی ہے۔ وہاں کوئی بھکاری نہیں۔ سب بادشاہ ہیں۔“
”میں جانتا تھا آپ چاروں سلجوقی ہیں۔“ فخر نے کہا۔ اسی لیے آپ کے
پاس ان کھڑا ہوا تھا۔“

”لیکن ہم کہیں بھیک نہیں دیں گے۔“ ایک سلجوقی نے کہا۔ ”ہم تمہاری
عبادت کی نہیں کرنا چاہتے۔“

سلطان محمود غزنوی کھانے سے فارغ ہو چکا تھا۔ اس نے کھانا فراغت
سے نہیں کھایا تھا۔ کھانے کے دوران وہ اپنے وزیر سے اپنی غیر حاضری کے
عرصے کی رپورٹیں لیتا رہا تھا۔

”سلجوقیوں کا خطرہ بڑھتا جا رہا ہے۔“ وزیر نے اسے بتایا تھا۔ ”سلجوقی
ایک جنگی طاقت بن گئے ہیں۔ اسرائیل سلجوقی میں کوئی ایسی کشش ہے کہ بخارا
اور کچھ اور علاقوں کے ایسے لوگ بھی اس کے ساتھ مل گئے ہیں جو سلجوقی نہیں۔
اسرائیل سلجوقی نے اپنے قبیلے کو کرائے کی فوج بنا دیا ہے۔ ایٹیکن کے ساتھ
اب بھی اس کا اتحاد اور جنگی معاہدہ ہے۔“

”یہ خطرہ میرے ساتھ ہندوستان میں بھی گیا تھا۔“ سلطان محمود نے کہا اور
وزیر کو تفصیل سے سنایا کہ دو سلجوقی کمانڈروں نے چند ایک ہندو گاڑی بانوں
کے ذریعے ہمارا جگمڈہ کو غزنی کی فوج کی نقل و حرکت سے آگاہ کرنے کی کوشش
کی تھی مگر غزنی نام کی ایک لڑکی نے جو کمانڈر عزیز دانی کی بیوی ہے، بروقت
ان ہندوؤں کو پکڑا دیا تھا۔

”اے یہ خطرہ یہاں بھی آپ پر منڈلا رہا ہے۔“ وزیر نے کہا۔ ”آج چار
سلجوقی پکڑے گئے ہیں۔ وہ دیکھنے آئے تھے کہ آپ کے ساتھ جو فوج واپس

آئی ہے فکتنی ہے اور کس حال میں ہے۔ وہ آپ کے قتل کی باتیں بھی کر
رہے تھے۔“

”کیا وہ مان گئے ہیں کہ وہ جاسوسی کرنے آئے تھے اور ان کا ارادہ
بھی قتل کرنے کا بھی تھا؟“ سلطان محمود نے پوچھا۔ ”وہ کہاں ہیں؟“
”وہ یہیں ہیں۔“ وزیر نے کہا۔ ”حکم فرمائیں تو انہیں آپ کے سامنے
لایا جائے۔ ان سے اگوا لیا گیا ہے کہ وہ یہاں بہت بڑی نیبت سے لائے
تھے۔“

چار آدمیوں کو اُتار لایا گیا جن کے پاؤں میں ٹیریاں تھیں۔ ان کے سر
ڈول رہے تھے اور ان سے کھڑا نہیں ہو جاتا تھا۔ صاف یہ چلتا تھا کہ ان
پر تشدد کیا گیا ہے۔ وزیر نے دربان کو کسی کا نام بتا کر کہا کہ اسے اندر بھیج دو۔
ایک فخر آمد آیا جس کے کپڑے پھلے پرانے اور غلیظ تھے۔ اس کی داڑھی
اور سر کے لمبے لمبے بال پسینے اور مٹی سے جڑے ہوئے تھے۔ اس کے
ایک ہاتھ میں لاکھڑی اور دوسرے میں کنگول تھا۔

”سلطان عالی مقام! وزیر نے کہا۔ یہ ہے وہ بھکاری جس نے
ان کی باتیں سنیں پھر ان پر نظر رکھی کہ کہاں جاتے ہیں اور جب یہ اپنے بھگانے
پر پہنچے تو اس فقر نے چھایہ سردا کر انہیں پکڑا دیا۔ جس کے گھر ٹھہرے تھے
وہاں کی ملاشی لی گئی ہے۔ وہاں بھی مشکوک تھے۔ یہ فخر تھی کہ جاسوسی کا عہدیدار
ہے۔ ہم نے جب دیکھا کہ آپ کے استقبال کے لیے لوگ ہجوم در ہجوم ہار پھیل
آئے ہیں تو ہم نے ان لوگوں میں جاسوس پھیلادیتے تھے۔ یہ عہدیدار آپ
کو بتائے گا کہ اس نے ان پر کیوں شک کیا تھا۔“

”میں نے دیکھا کہ لوگ فتح و نصرت کے نعرے لگا رہے تھے۔“ فخر تو ان
کے بھیس میں اس جاسوس عہدیدار نے بتایا۔ ”ہر کوئی اپنی اور گونڈنے کی
کیفیت میں تھا لیکن یہ چاروں بڑی منجیدہ رضی سے آپ کو دیکھ رہے تھے
جیسے انہیں افسوس ہو رہا ہو کہ لوگ فاتحانہ نعرے لگا رہے ہیں۔ میں نے

قریب ہو کر ان کی باتیں سنیں۔ اُس کی ان کے ساتھ جو باتیں ہوتی تھیں وہ اُس نے سلطان کو بتائیں۔

”کیا تم اب اپنے ارادوں کے متعلق مجھے کچھ بتانا چاہو گے؟“ سلطان محمود نے ان سچوئوں سے پوچھا۔ میں نے سنا ہے کہ تم نے تسلیم کر لیا ہے کہ تم مجھے قتل کرنے آئے تھے۔“

”نہیں سلطان محمود!۔ ایک سچوئی نے کہا۔ ہم میں ایک نے آپ کے قتل کی بات کی تھی لیکن قتل کا ارادہ نہ تھا۔ ہم جب پکڑے گئے تو سب کچھ بتا دیا تھا۔ ہم پر بہت تشدد کیا گیا ہے۔ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ ہمارے دلوں میں جو کچھ تھا وہ صاف بتا دیا تھا۔ ہم سچوئی ہیں۔ ہم جھوٹ نہیں بولا کرتے۔ ہم آپ کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ آپ نے ہمیں ایک بار شکست دی ہے۔ ہم اس شکست کا انتقام لیں گے۔ ہم ہندو نہیں مسلمان ہیں۔ ہمارا کوئی ملک نہیں۔ زمین کا کوئی ایسا خطہ نہیں جسے ہم اپنا وطن کہہ سکیں۔ ہم پیاراؤں میں رہتے ہیں۔ ہم اپنا وطن حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”لیکن تمہاری نظر صرف میری سلطنت پر کیوں جم گئی ہے؟“ سلطان محمود نے پوچھا۔ ”تم کبھی کمزور حکمران سے اُس کی زمین چھین سکتے ہو۔“

”کمزور سے کچھ چھیننا ہماروں کا شیوہ نہیں۔“ ایک سچوئی نے کہا۔ ”آپ ہم سے زیادہ طاقتور ہیں۔ ہم آپ کی سلطنت کے کسی حصے کو اپنا وطن بنائیں گے۔۔۔ ہماری اس بات کو بیچ مانیں کہ ہم آپ کو قتل نہیں کرنا چاہتے۔ ہم آپ کی جتنی طاقت کو کمزور کریں گے اور میدان جنگ میں آپ کو مارنے کی کوشش کریں گے۔“

”مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے کہ تم بہادر جنگجوؤں کی طرح میری بات کر رہے ہو جو تمہارے دل میں ہے۔“ سلطان نے کہا۔ ”میں بھی تمہارے ساتھ بہادر جنگجوؤں جیسا سلوک کروں گا۔ تم غزنی کے ہمان ہو۔ اُس نے وزیر سے کہا۔“ ان کی بیڑیاں کھول دو۔“

ان کی بیڑیاں کھلے لٹکیں سلطان محمود کو رہا تھا۔ ”غزنی کی فوج کے متعلق متدبرا کیا خیال ہے؟“

”بہت طاقتور فوج ہے۔“ ایک سچوئی نے کہا۔ ”ہمارا خیال تھا کہ یہ فوج ہندوستان سے کمزور ہو کر آئے گی لیکن انہیں اور گھوڑوں کے لحاظ سے یہ اور زیادہ طاقتور ہو کر آئی ہے۔“

”کیا تمہارا سردار اسرائیل سچوئی ہمارے خلاف لڑے گا؟“

”اس کا جواب وہی دے سکتا ہے۔“ سچوئی نے کہا۔ ”ہم سے صرف ہمارے متعلق پوچھیں۔“

”میں کچھ نہیں پوچھوں گا۔“ سلطان محمود نے کہا۔ ”میں تمہیں کچھ بتاؤں گا۔ اپنے سردار اسرائیل سچوئی کو میرا سلام کہنا اور اُسے کہنا کہ میں تمہیں پرانا سے نکال کر دریا نے جیون کے پار کا بہت سا علاقہ دے دوں گا۔ تم اپنے تمام قبیلے کو وہاں منتقل کرو اور اسے اپنا وطن بنا لو۔ اُسے کہنا کہ ایک ہی

مذہب کی دو فحش ایک دوسرے کا خون بہائیں گی تو فائدہ یہودیوں اور نصاریوں کو پہنچے گا۔ وہ میرے بھی اتنے ہی دشمن ہیں جتنے تمہارے ہیں۔ انہیں موقع ملا تو ہم دونوں کو نیست و نابود کریں گے۔ اُسے یہ بھی کہنا کہ ہر کسی کی موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ فتح اور شکست اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ تمہارے اپنے آدمی میرے ساتھ ہندوستان بھیج کر وہ ہندوستان کے ایک بہت بڑے طاقتور سردار کو میرے جنگی راز دے کر مجھے شکست دلائیں مگر وہ ایک ایسی عورت کے ہاتھوں اسے انجام کو پہنچے جو تمہارے دوست ایک خان کے خاندان کی ہے۔ تم بہادر جنگجو ہوتے تو وہ عورتوں سے وہ کام نہ کرتے جو مردوں کو کرنا چاہیے تھا۔ تم نے ہندوؤں کو ساتھ ملا کر مجھے دھوکہ دینا چاہا مگر تم نہیں جانتے کہ ہندو مسلمان کا دوست نہیں ہو سکتا۔۔۔ اپنے سردار سے یہ بھی کہنا کہ جس کے ہاتھوں تم نے مجھے شکست دلانے کا انتظام کیا تھا، اُسے خدا نے ایسا مرعوب کیا کہ

وہ لڑے بغیر میدان جنگ سے غائب ہو گیا۔ یہ اللہ کی شان ہے۔ تم بھی اللہ کے آگے سر جھکا دو۔ اُسے کہنا کہ مجھے ملے۔ وہ میرے پاس آنا چاہے تو میں اُس کے پاس چلا جاؤں گا۔ میرا پیغام اُس تک پہنچا دینا... جاؤ، میں تمہیں آزاد کرتا ہوں۔“

✱

اس داستان کی پچھلی کڑی میں بتایا جا چکا ہے کہ غزنوام کا ایک جنگو قبیلہ تھا جس کا اپنا کوئی وطن نہیں تھا۔ وہ پیاروں میں خانہ بدوش رہتا تھا۔ اس قبیلے کا ایک سردار لقمان تھا جو اپنے آپ کو سلجوقی کہلاتا تھا۔ وہ قبیلے میں انتہا مقبول تھا کہ اس نے ایک الگ تھلک سلجوقی قبیلہ بنالیا۔ غز قبیلے کے بیشتر لوگ اس کی اطاعت میں آگئے اور سلجوقی تسلطانے لگے۔ یہ لوگ آزاد زندگی بسر کرتے تھے۔ ادھر ادھر سے جویشی چوری کر لاتے تھے۔ قافلوں کو بھی لوٹ لیتے تھے۔ وہ ہیلڈیوں میں بڑی خوشنما اور سرسبز جگہوں میں بستے تھے۔ نوجوان لڑکیاں بھی اغوا کر لیتے تھے لیکن ظلم و تشدد وہیں کرتے تھے۔ ان میں آئی، بولی، باہر کی لڑکی خوش رہتی تھی۔

انہوں نے اپنے رہن سہن اور طور طریقوں میں ایسی دلکشی پیدا کر رکھی تھی کہ غیر سلجوقی خانہ بدوش بھی ان میں شامل ہو گئے اور سلجوقی کہلانے لگے۔ ساٹھ سو برسوں میں ان کی تعداد باہر کے قبیلوں کی شمولیت اور دو تین نئی قبائلیں پیدا ہونے سے کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ یہ چونکہ جنگو قبیلہ تھا اس لیے اس کی حیثیت ایک فوج کی ہو گئی تھی۔ انہیں چھوٹے موٹے مسلمان حکمران ایک دوسرے کے خلاف لڑاتے تھے۔ ترکمانیوں اور سامانیوں کی لڑائیوں میں سلجوقیوں نے سامانیوں کا ساتھ دیا تھا۔ پھر ایک اور حکمران التگین نے سلجوقیوں کے ساتھ سلطان محمود کے خلاف جنگی معاہدہ کر لیا تھا اور دونوں نے سلطان محمود سے شکرت کھائی تھی۔ شکست کھانے والا اسرائیل سلجوقی تھا جو لقمان سلجوقی کا بیٹا تھا اور اُس کے رہنے کے بعد سلجوقی قبیلے کا سردار بنا تھا۔

اسرائیل سلجوقی کے متعلق بتایا جا چکا ہے کہ وہ بڑا خوبصورت جوان تھا۔ اُس کی شخصیت میں ایسا اثر تھا کہ اُس کے پیروکار اُس کا وہ حکم بھی فوراً ماننے لگتے جس میں فیضی موت کا خطرہ ہوتا تھا۔ اُس نے لڑائیوں میں مختلف حکموں کی مدد کر کے اپنا خزانہ بھریا تھا اور اُن کی کمزوریوں اور ہوس پرستی سے بھی وہ بہت فائدہ اٹھاتا تھا۔

سلطان محمود ہندوستان سے واپس آیا تو اُس کے وزیر نے اُسے بتایا کہ اسرائیل بہت بڑی طاقت بن گیا ہے اور سلطنت غزنی کے لیے ایک ایسا خطرہ ہے فوراً دبا لینا بہت ضروری ہو گیا ہے۔ سلطان کو چار سلجوقی جاسوسوں کی صورت میں اسی وقت ثبوت مل گیا تھا۔ سلطان نے تدبیر سے کام لے کر ان سلجوقیوں کو مار دیا اور ان کے سردار اسرائیل سلجوقی کو پیغام بھی بھیج دیا کہ وہ اُسے ملے۔ ”جو شخص آپ کے قتل کے منصوبے بنا رہا ہے اور جو آپ کی سلطنت کے لیے خطرہ بنا ہوا ہے، اُس سے آپ دو تین ملاقات کریں گے“۔ وزیر نے حیران سا ہو کر سلطان سے پوچھا۔

”ہاں، میں اُسے دو دست بنانے کی کوشش کروں گا“ سلطان نے کہا۔ اسرائیل سلجوقی خواہ نام کا مسلمان ہے مسلمان تو ہے۔ ہم ایک دوسرے کا بہت خون بہا چکے ہیں۔ ایک میری وہ جرات ہے کہ میں اپنے ملک سے اتنی دور ہندوستان کے وسط تک چلا جاتا ہوں جہاں کی زمین اور جہاں کا آسمان بھی میرا دشمن ہوتا ہے۔ اور یہ بھی ایک جرات بتاتی ہے کہ اپنے بھائی کی مغزشیں محاف کر دو اور اس کے آگے جھک جاؤ۔ یہ میری بد نصیبی ہے کہ مجھے دوہریس ایک ساتھ سر کرنی پڑ رہی ہیں۔ ایک طرف ہندوستان ہے۔ اس خطے کو میں محمد بن قاسم کی امانت سمجھتا ہوں۔ یہ دارالاسلام تھا جو بت خانہ بن گیا ہے اور میں اسلام کو فر دغا دینے کے علاوہ ہندوؤں کی اُس جنگی طاقت کو ختم کر رہا ہوں جو ختم نہ ہوئی تو صرف ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کے لیے بہت بڑا خطرہ بن جائے گی۔ ایک طرف یہودی اور لہڑی ہیں، دوسری طرف ہندو

نہ ہوئی تو صرف ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کے لیے بہت بڑا خطرہ بن جائے گی۔ ایک طرف یہودی اور لہڑی ہیں، دوسری طرف ہندو

ہیں۔ یہ دو پہاڑ ہیں جو ہماری طرف مرک رہے ہیں۔ ہم نے یا جس دور میں بھی مسلمانوں نے ان سے توجہ نہالی یا ان کے جھانے میں آگئے مسلمان آپس میں ٹکرائے اور ختم ہو جائیں گے....

”دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے مسلمان بھائی میرے دشمن ہو گئے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کا بہت خون بہا چکے ہیں۔ بادشاہی اور سلطانی کی ہوس نے انہیں اندھا کر رکھا ہے۔ اسرائیل سلجوتی واقعی ایک جنگی طاقت بن گیا ہے۔ میں اس طاقت کو طاقت سے ختم کر سکتا ہوں۔ کفار کا یہی مقصد ہے۔ میں کفار کا یہ مقصد ٹوٹا نہیں ہونے دوں گا۔ میں کوشش کروں گا کہ اسرائیل سلجوتی میری شرائط تسلیم کر لے۔ میں اسے ایک وطن دے دوں گا۔“

✱

بیس بائیس روز بعد اسرائیل سلجوتی بخارا کے پہاڑی علاقے میں ایک بڑی ہی حین اور گھنڈی جگہ بیٹھا تھا۔ اس کے پاس اُس کی بیوی مریم بیٹھی تھی اور ان دونوں کے پاس دو ادھیڑ عمر آدمی بیٹھے تھے۔ اسرائیل کے سامنے وہ چار سلجوتی بیٹھے ہوئے تھے جنہیں غزنی میں جاسوسی کے جرم میں پکڑا گیا تھا لیکن سلطان محمود نے انہیں رہا کر دیا تھا۔ وہ اسرائیل سلجوتی کو تفصیل سے سنا چکے تھے کہ وہ کس طرح پکڑے گئے، سلطان محمود نے ان کے ساتھ کیا باتیں کیں اور اسرائیل کے نام کیا پیغام دے کر رہا کر دیا ہے۔

”تم کہتے ہو کہ سلطان محمود نے کہا تھا کہ وہ ہمیں ایک خط دے گا جو ہمارا دل ہوگا۔“ اسرائیل سلجوتی نے کہا۔ ”کیا اُس نے یہ بات تمہیں کسی سے کہی تھی یا نہیں طعنہ دیا تھا؟ کیا تم بتا سکتے ہو کہ اُس نے یہ بات گھنڈ میں کہی تھی؟“

”نہیں۔“ ایک سلجوتی نے جواب دیا۔ ”وہ سنجیدہ معلوم ہوتا تھا۔ اگر اُس کے دل میں گھنڈ ہوتا تو وہ یہ نہ کہتا کہ جہاں آپ اسے بلنا چاہیں گے وہ وہیں سبھائے گا۔“

”اُسے بہت چل گیا ہے کہ سلجوتی اب اسنے طاقتور ہو گئے ہیں کہ اپنی شرطیں

منوا سکتے ہیں۔“ اسرائیل سلجوتی کی بیوی مریم نے کہا۔

مریم سلطان محمود کے ایک بدترین دشمن ایک خان کی بیٹی تھی۔ وہ بڑی ہی حین اور جہاں لڑکی تھی۔ اُس نے شادی سے پہلے اسرائیل سے کہا تھا۔

”میں اُس مرد پر اپنا سب کچھ قربان کر دوں گی جو سلطان محمود کی سلطنت کو تباہ کر کے اسے بھگنے کے لیے ان پہاڑوں میں چھوڑ دے گا۔“ اُس نے اسرائیل سلجوتی سے یہ بات اس لیے کہی تھی کہ اسرائیل نے ایک خان سے کہا تھا کہ وہ سلطان محمود کو مرادے گا۔ اسی وعدے پر مریم نے اسرائیل کے ساتھ شادی کی تھی مگر اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ اسرائیل سلطان محمود کی اس پیش کش پر غور کر رہا ہے کہ وہ سلجوتیوں کو ایک الگ وطن دے گا۔

اسرائیل سلجوتی نے ان چاروں آدمیوں کو اور ان دو آدمیوں کو بھی جو اس کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، اٹھا دیا۔ اس کے پاس مریم آگئی رہ گئی۔

”میں ایسی بات نہیں سنا چاہتی کہ آپ نے سلطان محمود کی پیشکش قبول کر لی ہے۔“ مریم نے اسرائیل سے کہا۔ ”وہ حالات کچھ اور تھے جو آپ کی شکست کا باعث بنے تھے۔ اب آپ کو کسی سے نہیں ڈرنا چاہیے۔ ہماری اپنی طاقت کے علاوہ ایٹکین ہمارے ساتھ ہے۔ تو خان خان ہمارے ساتھ ہے۔ اپنے دشمن کے لایچ ہیں نہائیں۔ ہم اب اپنا وطن دوسروں سے ملک چھین کر بنا سکتے ہیں۔“

”سنو مریم! اسرائیل سلجوتی نے کہا۔“ میں جانتا ہوں کہ تمہارے دل میں سلطان محمود کی اتنی نفرت نہیں جتنی یہ خواہش تمہارے دل میں تڑپ رہی ہے کہ تم ایک ملک کی ملک بنو۔ میں تمہیں ملک بنا دوں گا لیکن میں سب سے پہلے زمین کا ایک ٹکڑا چاہیے جسے ہم اپنا وطن کہہ سکیں۔ وہاں ہم اپنی فوج کو باقاعدہ تربیت دیں گے۔ وہاں ہمارے قلعے ہوں گے۔ اب ہماری یہ حالت ہے کہ فوج لڑتی ہوئی پیچھے ہٹتی ہے تو ہمیں کہیں پناہ نہیں ملتی۔ ہم قبائلی اور جنگی کہلاتے ہیں۔ مجھے محمود سے کچھ وصول کر لینے دو۔“

صبح کا اجالا نکھر رہا تھا۔ ایک جگہ چٹانوں نے اوٹ بنا رکھی تھی۔ داییں بائیں اور پیچھے تین چٹانیں تھیں۔ ان کے درمیان تنگ سی جگہ خالی تھی۔ زمین درخت ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ تھے۔ درمیان والے درخت کے ساتھ مریم یوں کھڑی تھی کہ اس کی پیٹھ تنے کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ ہاتھ پیٹھ پیچھے بندھے تھے اور ایک رستی اُس کے گھٹنوں اور تنے کے گرد لپٹی ہوئی تھی۔ اسی طرح ساتھ والے درختوں کے ساتھ وہ دونوں آدمی بیٹھے ہوئے تھے جو رات مریم کے ساتھ تھے۔ ان کے سامنے اسرائیلی سلجونی ٹنل رہا تھا۔ تین نیر انداز کالوں میں تیر ڈالے آٹھ دس قدم دودھ کھڑے تھے۔

”میں جانتا تھا تم دونوں یہودی ہو۔“ اسرائیلی سلجونی نے ان دونوں سے کہا۔ اور تم مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کے ماہر ہو۔ میں نے تمہارے سپرد یہ کام کیا تھا کہ دو چار ریکوں اور دو چار آدمیوں کو تیار کرو جو سلطان محمود کی جنس کاٹیں مگر تم مجھے قتل کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ یہ لوگ سانپ ہیں جو اپنے مالک کو بھی ڈس لیتے ہیں.... اور اس ناگن کو دیکھو! اُس نے اپنی بیوی مریم کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”بیک وقت دو آدمیوں کی بیوی بنی رہی۔ تم ملکہ بننا چاہتی تھیں۔۔۔ ایسی خواہش کہ تمہیں یہ بھی یاد نہ رہا کہ تمہارا خاوند کون ہے۔“

”میں تمہیں آخری بار کہہ رہی ہوں کہ سلطان محمود کے دھوکے میں نہ آنا۔“ مریم نے غصے سے چلا کر کہا۔

”آج تم کو کچھ بھی کہو گی آخری بار کہو گی۔“ اسرائیلی نے کہا۔ اور میں تمہیں آخری بار بتا دیتا ہوں کہ میں تمہارے دھوکے کے باوجود تو غان خان کو اپنا دوست اور سلطان محمود کو اپنا دشمن سمجھوں گا اور ایک روز تو سلطنت غزنی کو بھول جائیں گے اور سلطنت سلجونی کو یاد کیا کریں گے۔“ اُنہی نے گردن مان کر کہا۔ ”میں سلطان محمود سے ایک خط لے لوں گا اور وہی خط غزنی کی فوج کا، سلطان محمود کا اور سلطنت غزنی کے عروج کا قبرستان بنے گا۔“

مریم کی کچھ میں آگئی مگر وہ جو د آدمی اسرائیل کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، وہ نہیں چاہتے تھے کہ مریم اسرائیل کی یہ بات سمجھ دے کہ وہ ایک قدرتی اوٹ میں بیٹھے تھے۔ مریم ان کے ساتھ تھی اور انہیں کڑی رہی تھی۔ ”میں نے اس شخص کے ساتھ صرف اس لیے شادی کی تھی کہ یہ سلطان محمود کا کام تمام کر دے گا مگر اس کی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شخص غزنی کے اس سلطان کے بھلنے میں آجائے گا۔ اس نے مجھے یہ تو کہا ہے کہ وہ محمود سے کچھ وصول کرنا چاہتا ہے مگر مجھے اس کی نیت پر شک ہے۔ یہ محمود کا ٹیلی بن جانے گا۔“

”ستتاری نظر میں کوئی اور ہے جو سلجونی قبیلے کی سربراہی کر سکے؟“ دونوں میں سے ایک نے پوچھا۔

”تو غان خان!۔“ مریم نے کہا۔ ”وہ میرا چچا زاد ہے۔ میں اُس کے ساتھ شادی کر لوں گی۔ وہ مجھے ایسا بُری طرح چاہتا ہے کہ میں نے جب اسرائیل کے ساتھ شادی کی تھی تو تو غان خان زہر کھانے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ مجھے پتہ چل گیا۔ میں اُسے ملی تو اُس کی حالت بالکل جیسی ہو چکی تھی۔ میں اُسے زندہ دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ اپنے باپ کا جانشین تھا، پھر اُس کا باپ رہ گیا اور وہ باپ کا جانشین بنا لیکن ذہنی طور پر وہ اس قابل نہ تھا۔ میں نے اُسے زندگی دی اور زندگی اس طرح دی کہ اسرائیل سے چوری پیچھے اُس کی بھی بیوی بنی رہی۔ یہ سلسلہ اب تک چل رہا ہے.... مجھے امید ہے کہ اسرائیل کا خاتمہ ہمارے لیے بہتر ہوگا۔ تو غان خان ہمارا مقصد پورا کر دے گا۔“

ایک سایہ سا اُن جھڑیوں کے عقب سے نے آواز گزر گیا جن کی اوٹ میں وہ بیٹھے تھے۔ دونوں آدمیوں نے اُٹھ کر دیکھا۔ بادل کے ایک ٹکڑے کا سایہ ریگتہ جا رہا تھا۔ یہ ٹکڑا چاند کے آگے سے گزر گیا تھا۔

”کون تھا؟“ مریم نے سرگوشی میں پوچھا۔

”میرا خیال ہے بادل کا ٹکڑا چاند کے آگے سے گزرا ہے۔“

آدمی آیا جو جاسوسی اور سرانجامی کے محکمے کا تھا۔ یہ سنایا جا چکا ہے کہ کالجی
کا مہاراجہ گندہ کسی پراسرار خوف کے زیر اثر طرے بغیر میدان چھوڑ کر بھاگ گیا
تھا۔ کسی بھی سوئے نے اُس کے بھاگ جانے کی وجہ اس کے سوا اور کچھ
نہیں سمجھی کہ اُس پر کوئی پراسرار خوف طاری ہو گیا تھا۔ اس پراسرار خوف
کی وضاحت کبھی بھی تحریر سے نہیں ملتی۔ بہر حال یہ ایک تاریخی حقیقت ہے
کہ سلطان محمود کو اتنی آسان فتح کبھی بھی حاصل نہیں ہوئی تھی۔

ہمارا جگندہ کا انتخاب گوالیار کا مہاراجہ ارجن تھا۔ اُسے بھی بھاگنا
پڑا تھا۔ سلطان محمود واپس غزنی چلا گیا تھا۔ اس کا ایک قلعہ دارالقدر سلجوقی
قنوج کے قلعے میں تھا۔ اُس نے اپنے جاسوس کالجی اور گوالیار بھیج دیے
تھے۔ انہوں نے دارالقدر سلجوقی کو جو اطلاعات اور معلومات دی تھیں، وہ
ایک جاسوس خود سلطان محمود کے پاس لایا تھا۔ یہ جاسوس اسی علاقے کا ایک
مسلمان تھا۔ وہ ہندو رشی کے بہروپ میں کالجی گیا تھا۔

”ہمارا جگندہ کالجی پہنچے ہی ہوش میں آ گیا تھا۔ جاسوس نے سلطان محمود
کو بتایا۔ ”وہ جب میدان جنگ سے بھاگا تھا تو میں فوراً ہی کالجی چلا گیا تھا
اور اُس بڑے مندر میں جاؤں گے ڈالے تھے جس میں کبھی کبھی ہمارا جگندہ
عبادت کے لیے جا کرتا ہے۔ اس کی راہدہانی بھی خوف سے کانپ رہی
تھی۔ مندروں کے سنگھوں اور گھنٹوں نے ایسا دایلا بیا کیا تھا کہ سارا کالجی
ہراساں ہو گیا تھا۔ میں خود تو ابیں دیکھ سکا، مجھے بتایا گیا کہ ہمارا جگندہ وہیں
مندروں میں رکھا گیا تھا۔۔۔۔“

”میں نے ایک روز شہر کی ایک گلی میں ایک عورت کو اپنے مکان کی دھڑیل
پٹے میں کرتے دیکھا۔ یہ چونک رہی تھی۔ اسی لیے میں نے اس عورت سے

رفسے کی وجہ پوچھی۔ اُس نے دانت پیس کر کہا کہ تم سنت سادھو ہو، میرا
پر واپس لاؤ۔ پتہ چلا کہ پنڈتوں نے اپنا حساب کتاب کر کے ہمارا جگندہ کو
بتایا تھا کہ میں ایسے بچوں کی قربانی دینی ہے جن کی عمریں چھ ماہ سے زیادہ نہ

”تم جیسے جاہل اور گنوا قبائلی دوسروں کے لیے بڑھو کر اس میں خود دفن
ہوا کرتے ہیں۔“ دخت سے بندھے ہوئے ایک یہودی نے کہا۔ ”سنو
اسرائیل! تمہارا نام اسرائیل اس لیے ہے کہ تمہاری رگوں میں یہودی خون
ہے۔ اس خون کی لالچ رکھتے ہوئے میں تمہیں کام کی باتیں بنانا ہوں۔ تم نے
ٹھیک کہا ہے کہ وہ دونوں یہودی ہیں اور ہم نے اپنے نام اور خلیے مسلمانوں
جیسے رکھے ہوئے ہیں۔ ہم اسلام کے متعلق اتنا علم رکھتے ہیں جو تمہاری
مسجدوں کے امام بھی نہیں رکھتے۔ ہم مسلمانوں کا ایمان خریدنے کے ماہر ہیں۔
یہ اتفاق کی بات ہے کہ ہماری باتیں تمہارے کسی آدمی نے سن لی تھیں اور
ہم پکڑے گئے۔ لیکن تم ہماری تعریف نہیں کرتے کہ ہم تمہیں تمہاری بیوی
کے ہاتھوں قتل کر رہے تھے،۔۔۔ میں تمہیں صاف بتا دیتا ہوں کہ تمہارا انجام
قریب آ گیا ہے۔ تم سلطان محمود کو شکست نہیں دے سکتے۔ وہ ایمان کا
پکا ہے۔ ہم وہیں کامیاب ہوتے ہیں جہاں ایمان کچا ہوتا ہے، اور جہاں
ایمان کچا ہوتا ہے وہاں شکست لازمی ہوتی ہے۔ ہمیں مسلمانوں کے
ایمان کی بچھائی اور نا بچھائی کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔ ہمارا کام ہے کہ پکچے
ہو پکے کو الپس میں ٹکراتے رہیں۔ شکست چھیننے کی ہوتی ہے مگر ہم اُسے
یقین دلائے رکھتے ہیں کہ تم سب سے زیادہ بکے ہو۔“

”تم ذلیل یہودی! اسرائیل نے دانت پیس کر کہا۔ ”مجھے طے ہے
رہے ہو؟“ اُس نے ایک طرف ہٹ کر تیر اندازوں کو اشارہ کیا۔

تین تیریک دقت کمانوں سے بچنے اور دونوں یہودیوں اور مریم کے
سینوں میں اتر گئے۔

”اور تیر نہ چلانا۔“ اسرائیل سلجوقی نے کہا۔ ”انہیں یہیں بندھا دینے
دو۔ ان کی لاشیں گدھ اور بھڑیے کھا لیں گے۔“

دو چار مہینے ہی گزرے تھے کہ ہندوستان سے غزنی کی فوج کا ایک

یہاں انسان بُت بنا کر انسانوں کو ان کے لیے ذبح کر رہے ہیں۔ اگر میں یہ نیکی کرگزروں تو مجھے صرف یہ جہا عطا کر کہ جس مقصد کے لیے یہاں آیا ہوں وہ پورا ہو جائے۔۔۔

”اس تاریک غلام گردش میں مجھے امیدی کی کرن نظر آئی۔ لڑکی کہ ربی تھی۔“ مجھے لے چلو۔ جہاں جی چاہے لے چلو۔ یہاں سے لے چلو یہاں سے نکال لو۔ میں بھاگ آئی ہوں۔ وہ مجھے ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ اُس کا جسم کانپ رہا تھا جیسے بے لباس ہو کر سرد پانی میں کھڑی ہو۔ مجھے تیز تیز قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے لڑکی سے کہا کہ وہ دل مضبوط کرے اور خاموش ہو جائے۔ اُسے اپنے بازو میں لے کر میں ایک طرف ہو گیا۔ وہاں سے دیوار کٹی ہوئی تھی جیسے غار بنا ہوا تھا۔ وہ ایک کمرہ سا تھا۔ باہر سے آواز آئی۔ یہاں دیکھ لو۔ جا کماں سکتی ہے۔۔۔

”میں نے ریشیوں کا جو لباس پہن رکھا تھا اس کے اندر خنجر تھا جو میں نے نکال لیا۔ باہر شاید دو آدمی تھے۔ ایک وہیں اندر آ گیا جہاں میں لڑکی کو لے کر چھپا تھا گھپ اندھیرا تھا۔ وہ مجھے دروازے میں جس کے کواڑ نہیں تھے، سیاہ بھوت کی طرح نظر آیا۔ بولا۔ ”اندر کون ہے۔“ وہ آگے آیا تو میں نے اُسے خنجر مارنے کی بجائے، پیچھے ہو کر اُس کی گردن دبوز لی۔

باہر سے آواز آئی۔ ”بے یار نہیں!“ میں نے جواب دیا۔ ”نہیں ہے۔ تم باہر کو دوڑو۔“ مجھے باہر دوڑتے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ وہ جس کی گردن میرے ہاتھوں کے شکنجے میں آگئی تھی، پھوڑی دیر تڑپ کر مر گیا۔۔۔

”میں نے جلدی جلدی اُس کے پیرے اُمارے اور لڑکی کو پہنا دیتے۔ اُس کا چہرہ مسخ کرنا عذر دی تھا۔ اُس کے بال کھٹے ہوئے تھے میں فرش کی مٹی پر ہاتھ پھر پھر کر اُس کے سنہ اور بالوں پر تار مارا۔ ایک کپڑا اُس کے سر پر ڈال دیا۔ جسے میں نے مار دیا تھا اُس کے گلے سے سونے موتیوں کی ڈالا مار کر لڑکی کے گلے میں ڈال دی اور اُسے باہر لے آیا۔ مجھے ان رستوں

ہوں چنانچہ اُسی روز تین ماؤں کی گودیوں سے نیچے اٹھائے گئے اور انہیں فوج کر کے ان کا خون پانی میں ملا کر ہمارا جگندہ کو اس میں منلایا گیا۔ اس عورت نے مجھے کہا کہ میرے نیچے کا خون کر لے والا اس دنیا میں سزا پائے گا۔۔۔

”میں نے زیادہ وقت مندر میں گزارا۔ پنڈتوں کے ساتھ میرا دوستانہ ہو گیا۔ ان سے مجھے راج محل کی باتوں کا علم ہونے لگا۔ سلطان غزنی دہلی کا ”عابدین!“ سلطان محمود نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”یہ بھولے جادو میں کہاں کا سلطان ہوں، یہاں سلطان ہوں بھی یا نہیں۔ مجھے یوں ساری بات سناؤ جیسے اپنے کسی دوست کے ساتھ باتیں کیا کرتے ہو۔“

سین کپڑا تھا کہ ہندوؤں کے مندروں کی دنیا کیسی پُر اسرار ہے۔ ہم ایک سیدھے سادے مذہب کے لوگ وہاں جا کر کھڑا جاتے ہیں عورت کا اس مذہب میں بہت دخل ہے۔ نوجوان حرکتیاں وہاں کی اندر جیسی غلام گردشوں میں یوں پھرتی ہیں جیسے ویرانوں میں چمکا ڈڑاڑتے پھرتے ہیں۔ میں مندر کی ایسی ہی ایک غلام گردش میں جا رہا تھا۔ کوئی میرے ساتھ کھرا گیا۔ وہ عورت تھی اور سبک رہی تھی۔ میرے ساتھ پلٹ گئی اور خوفزدگی سے کاہتی ہوئی ”سُرگوشیاں کرنے لگی۔“ مجھے پیالو۔ میں سدا ج کے لیے نہیں مرنے چاہتی۔ مجھے اپنے گھر لے چلو۔ مجھے اپنے پاس رکھ لینا۔ میں مرنے نہیں چاہتی۔۔۔

”میں سمجھ گیا کہ یہ کسی کی نوجوان اور کنواری بیٹی ہے جسے ہندو اس کی قربانی دینے کے لیے کھڑا لے ہوں گے۔۔۔ آپ مجھے مجرم کہیں گے لیکن سلطان عالی مقام! میں نے پناہ فرض نظر انداز کر دیا جس کے لیے میں مندر میں ٹھہرا تھا۔ میں نے اسے اپنا فرض سمجھا کہ ایک انسانی جان کو ایک جھوٹے اور بے بنیاد مذہب پر قتل ہونے سے بچاؤں۔ یہ ایک نیکی تھی اور میرا عقیدہ ہے کہ نیکی کو تو جہاں ملتی ہے۔ میں نے اپنے اللہ کو پکارا اور عرض کی کہ خدائے دوا کجلاں! از منگی اور موت میرے اختیار میں ہے۔“

میں اسے بھی محفوظ جگہ پہنچا سکتا ہوں....
 ”وہ سڑک سے بھی ڈرتا تھا۔ بہر حال وہ تیار ہو گیا اور اس نے پوچھا کہ
 اُسے کہاں پناہ مل سکتی ہے۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں اُسے قموچ کے
 قلعے میں لے جاسکتا ہوں۔ اُسے اپنی بیٹیوں سے بہت پیار تھا، حالانکہ
 ہندو اپنی جان بچانے کے لیے اپنی عورتوں کو چھوڑ کر بھاگ جایا کرتے ہیں۔
 وہ مجھے انعام پیش کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ اپنا انعام بعد میں بتلاؤ
 گا....“

”اُس کے خاندان کو میں نے چوری چھپے دہاں سے نکالا۔ وہ بہت
 بڑے رُتبے کا آدمی تھا۔ اُس نے گھوڑا گاڑی کا انتظام کر لیا تھا۔ راستے میں
 ایک ہلاؤ کیا تو اُس نے بتایا کہ وہ بے شمار سونا اور نقدی ساتھ لایا ہے۔ میں
 نے اُسے کہا کہ مجھے ان چیزوں کے ساتھ کوئی دیکھی نہیں۔ میں نے اُسے یہ
 بھی بتایا کہ میں مسلمان ہوں۔ تب اُسے پناہ کا میرا مقصد کیا ہے۔ اُس نے
 خوش ہو کر کہا کہ وہ میرا مقصد پورا کر سکتا ہے، کیونکہ وہ مہاراج گنڈہ کے
 اندر کے راز جانتا ہے۔ اُس نے بتایا کہ مہاراج گنڈہ میدان جنگ سے یک
 ایسا خوف لے کر بھاگ آیا تھا جس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ تم چونکہ
 ہندوستان کے ہی سب سے والے ہو اس لیے تمہیں معلوم ہو گا کہ ہمارے
 بعض سادھو، سینا سی، یوگی، جوگی اور پنڈت ایسا علم جانتے ہیں جس
 کا عمل کسی پر کیا جائے تو اُس کا دماغ کچھ عرصے کے لیے بے کار ہو جاتا
 ہے۔ یہ علم ہر کوئی حاصل نہیں کر سکتا۔ بعض یوگی ہمالیہ کی اُن بلندوں پر چلے
 جاتے ہیں جہاں برف کبھی نہیں پگھلتی۔ یہ لوگ دہاں تنگے رہتے ہیں اور
 ایسی طاقت حاصل کر لیتے ہیں جو دوسرے دیکھنے والوں پر اثر کرتی ہے...
 ”مہاراج گنڈہ اتنا کمزور آدمی نہیں کہ اتنی زیادہ فوج کے ہوتے ہوئے
 بغیر بڑے بھاگ آتا۔ وہ جب بھاگ کر آیا تھا تو کالنج کے لوگوں پر ایسی
 دہشت طاری ہو گئی تھی کہ لوگ گھروں سے بھاگ جانے کی تیاریاں

کا علم تھا۔ میں اُسے روشن راستے میں لے گیا اور دہاں میں اُسے مندر کے
 ایسے دیران اور ہیبت ناک جھمبے میں لے گیا جہاں فرش پر کی کی وجہ سے
 سبز کالی جی ہوئی تھی۔ میں نے کالی پر ہاتھ پھر کر لڑکی کے چہرے کا رنگ
 صدیوں پرانی ویواہوں اور فرشتوں جیسا کر دیا اور اُس کے بانوں میں مٹی ڈال
 کر اُسے سادھی بنا دیا....“

”وہ خوبصورت لڑکی تھی اور اس کی عمر چودہ پندرہ سال تھی۔ مندر کے
 اندر اور باہر اُس کی تلاش میں بھاگ دوڑ شروع ہو چکی تھی۔ پنڈت امدان
 کے چیلے گھبرائے گھبرائے ادھر ادھر دوڑتے پھر رہے تھے۔ وہ ہمارے
 قریب سے بھی گزرے۔ لڑکی کو کوئی بھی نہ پہچان سکا۔ میں اُسے مندر
 کے احاطے سے نکال کر شہر کے قریب ہی جنگل میں لے گیا۔ لڑکی نے بتایا
 کہ اُسے ایک دور دراز مندر میں فوج کیا جانا تھا۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ اُس
 کے ماں باپ اُسے قریب دیکھنے کے لیے بالکل تیار نہیں تھے۔ اس کا بارہا
 کے دربار میں اچھے رُتبے پر تھا۔ اُسے ڈرا کر اُسے رُتبے سے محروم کر دینے کی
 دھمکی دے کر لڑکی کو اُس سے لیا گیا تھا....“

”میں نے شام کے بعد اُس کے گھر جا کر اُس کے باپ کو بتایا کہ اُس کی
 لڑکی جنگل میں ہے۔ وہ بہت ڈرا ہوا تھا۔ اُس نے بتایا کہ اُس کے گھر کی تلاشی
 ہو چکی ہے باپ بہت ہراساں تھا۔ کہتا تھا کہ وہ لڑکی کو اب اپنے گھر نہیں رکھ
 سکتا کیونکہ پکڑا جانے کا اور مہاراج اُسے بڑی اذیت ناک سزا دے گا۔ وہ
 اس پر حیران تھا کہ میں رُشی تھا اور لڑکی کو قربانی سے بچا لایا تھا۔ میں نے
 اُسے بتا دیا کہ میں رُشی نہیں ہوں۔ ابھی اُسے یہ نہیں بتایا تھا کہ میں کون
 ہوں۔ اُس نے رو کر کہا کہ اُس کی ایک بیٹی اور بھی ہے جس کی عمر سترہ سال
 ہے۔ اُس کے گھر کی تلاشی لینے والے اُسے بگسنے ہیں کہ مہاری وہ بیٹی
 نہ ملے تو اس بیٹی کی قربانی دی جائے گی۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ پسند کرے تو۔“

کرنے لگے تھے۔ افزاء پھیل گئی تھی کہ غزنی کی فوج کا لہجہ کی طرف آہی ہے۔ ایک یوگی نے بتایا کہ مہاراجہ پر کسی نے عمل کر دیا ہے۔ اُس نے اس کا توڑ شروع کر دیا۔ اس کے لیے تین دودھ پیتے بچوں کو قربان کیا گیا۔ عمل کا اثر اُتر گیا۔ پھر یہ بھی ہمتہ جلا کر یہ کس لے کیا تھا۔ یہ ایک رانی نے کر لیا تھا جو اپنے بیٹے کو مہاراجہ کا جانشین بنانا چاہتی تھی لیکن مہاراجہ نے دوسری رانی کے بیٹے کو راجہ بنا دیا۔ مہاراجہ نے اس رانی کو اور اُس کے بیٹے کو قتل کر دیا ہے۔ رانی نے مہاراجہ سے کہا تھا کہ وہ اُسے قتل کر دے اُس کے بیٹے کو زندہ رہنے دے۔ مہاراجہ نے اُسے یہ شرط بتائی کہ وہ اُس یوگی کا سر اُٹا دے دے جس نے اُس کے دماغ کو اور اُس کی فوج کو کیل دیا تھا....

”رانی نے بتا دیا۔ وہ کسی یوگی تھا جو اب اُس عمل کا توڑ کر رہا تھا۔ مہاراجہ وعدے سے پھر گیا۔ اُس نے رانی کو درپردہ قتل کرا کے اُس کے بیٹے کو بھی قتل کر دیا ہے۔ جب ایک نے عمل کا اثر ختم کر دیا تو مہاراجہ نے اُسے بھی قتل کر دیا۔ پھر بڑے پنڈت مہارشی نے اُسے بتایا کہ اب ایک نوجوان کنواری کی قربانی ضروری ہے۔ اُس نے لڑکی کی کچھ نشانیاں بتائیں اور میری چھوٹی بیٹی کی نشاندہی کی کہ یہ ہے وہ لڑکی جو دیوتاؤں نے مانگی ہے۔ جس کو بچھا تھا کہ اُس نے میری بیٹی کی نشاندہی کیوں کی ہے۔ اُس نے ایک بار مجھ سے بڑی بیٹی مانگی تھی۔ میں نے انکار کر دیا تھا۔ تم مسلمان جو ہم نہیں جانتے کہ ہم دیوتاؤں کو ناراض کر دیں تو کچھ نہیں ہوتا۔ اگر پنڈت کو خفا کر دیں تو ہم پر آسمان ٹوٹ پڑتا ہے۔ ہمارا مذہب ہمارے پنڈت کا حکم اور خواہش ہے....

”پھر سلطان محترم اُس نے مجھے بتایا کہ ہوش آتے ہی مہاراجہ گندہ نے اپنی فوج کو اکٹھا کیا اور بتایا کہ اُسے ایک یوگی نے کیل دیا تھا۔ اُس نے اپنی فوج سے کہا کہ مسلمان خوش ہوں گے کہ انہیں لڑنے بغیر فتح ہوئی

ہے۔ اب میں انہیں پھر لکھاروں گا اور وہ پہلے والی فتح کے نشے میں بدست ہو کر آئیں گے اور تم انہیں ہلاک کرو گے، انہیں زندہ پکڑو گے اور یہاں ان گلیوں میں تم انہیں ٹھوٹوں اور گندھوں کی طرح اپنی گانڑوں اور لمبوں کے آگے جتو گے۔ ہر ہر مہادیو نے مجھے اشارہ دے دیا ہے کہ اب غزنی کے مسلمان یہاں تباہ ہونے کے لیے آئیں گے....

”اُس نے ایسے الفاظ کہے کہ فوج جوش سے بھر گئی۔ یہاں تک کہ جوجوان آدمی فوج میں نہیں تھے وہ بھی فوج میں شامل ہو گئے۔ پھر وہ گوالیار مہاراجہ ارجن کے پاس چلا گیا۔ بہت دنوں بعد واپس آیا تو اُس نے بتایا کہ گوالیار میں بھی وہ دہاں کی فوج اور دہاں کے لوگوں میں ایسی ہی آگ لگا آ رہی ہے۔ پھر وہ لاہور چلا گیا۔ دہاں سے اُسے یہ یلوسی ہوئی کہ مہاراجہ ترلوچن پال نے اُس کا اتحاد دی بن کر لڑنے سے انکار کر دیا لیکن اُسے اپنی بہت سی فوج اور سامان دے دیا ہے۔ مہاراجہ ترلوچن پال نے اسے مالی امداد دینے کا بھی وعدہ کیا ہے....

”سلطان عالی مقام! اس ہندو نے مجھے بتایا کہ لاہور کی فوج دو آہ گنگا جنامیں آگئی ہے اور یہ کالنج میں آ جائے گی۔ مہاراجہ گندہ نے کہا ہے کہ اب وہ غزنی کی فوج کو شکست دے کر سارے ہندوستان میں پھر جائے گا اور نہ کوئی مسجد کھڑی رہنے دے گا نہ کسی مسلمان کو زندہ چھوڑے گا....

”میں نے اُس سے پوچھا، کیا مہاراجہ گندہ بڑا ناک رمل ہے یا وہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ کر گزرنے کے قابل ہے؟ اُس نے جواب دیا کہ ہاں وہ اس قابل ہو گیا ہے۔ اُس نے یہاں تک ارادہ کر رکھا ہے کہ مہاراجہ ارجن کو ساتھ ملا کر لاہور پر بھی قبضہ کرے گا غزنی کی فوج کے جو چند ایک دستے یہاں فوج، بادی ہستہ، تھکر کوٹ، بھیرہ اور ملتان میں ہیں انہیں فوراً ختم کر دیا جائے گا۔ اب کے اُس کے ارادے بڑے خطرناک ہیں۔ اب تو عورتیں بھی لڑنے کی

تیاریاں کر رہی ہیں۔“

✱

اس جاسوس نے جس کا نام عابدین تھا، سلطان کو بتایا کہ اس ہندو کو قنوج پہنچا دیا گیا اور اس کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا گیا۔ اُس نے سالار ابوالقادر سلجونی کو سونا اور نقدی پیش کی اور کہا کہ اس کے عوض وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ اُس کی بیٹیوں کو پریشان نہ کیا جائے۔ اُس سے نہ کسی نے سونا لیا نہ نقدی اور اس کی بیٹیوں کو باعزت طریقے سے رکھا گیا۔ اُس نے ایسا اثر قبول کیا کہ وہ اپنا مذہب چھوڑنے کے لیے تیار ہو گیا۔ قطعے کے امام نے اُسے اس کے تمام کنبے سمیت مسلمان کر لیا۔

”سلطان محترم!“ عابدین نے کہا۔ ”ہم نے اُس کی ہر بات پر یقین نہ کیا، بلکہ اس کی بتائی ہوئی جگہوں پر جا کر دیکھا تو اس کی ہر بات سچ نکلی۔ ہمارے جو آدمی گوالیار میں ہیں، انہوں نے بتایا کہ جنگی تیاریاں زبردوں پر ہیں اور ہندوؤں کے ارادے یہ ہیں کہ سب سے پہلے غزنی کے اُن دستوں کو ختم کیا جائے گا جو مختلف جگہوں پر موجود ہیں۔ پھر سارے ملک میں مسلمانوں کے بچے بچے کو قتل کر دیا جائے گا۔ اگر کوئی مسلمان ہندو مت قبول کرے گا تو اُسے بھی زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔ اس کے بعد تمام ملک کی فوج غزنی کی طرف کوچ کرے گی۔ ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ لوگوں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلائی جا رہی ہے۔ ہندوؤں میں مسلمانوں کا ذکر پینڈلوں کی زبان سے یوں ہوتا ہے جیسے مسلمان کا قتل ثواب کا کام ہے۔“

”کیا تم بتا سکتے ہو کہ جنگی تیاریاں کس مرحلے میں ہیں؟“ سلطان محمود نے عابدین سے پوچھا۔ ”کیا تم جنگی انداز سے بات کو سمجھتے ہو؟“

”یقیناً کر سکتا ہوں۔“ عابدین نے جواب دیا۔ ”ہمارا جوں کی تیاریاں تقریباً آخری مرحلے میں ہیں۔ جو نئے لوگ فوج میں شامل ہوئے ہیں وہ اچھے گھوڑ سوار ہیں، تیر اندازی اور تیغ زنی میں بھی اچھے ہیں لیکن انھی کے کنبے ہیں۔“

ابھی وہ فوج کی شکل میں لانے کے قابل نہیں ہوئے۔ انہیں میدان جنگ کی سختیاں برداشت کرنے کی تربیت دی جا رہی ہے۔ سالار ابوالقادر سلجونی اور دوسری جگہوں کے کمانڈر ملنے بچے کہا تھا کہ میں آپ کو مشورہ دوں کہ آپ فوراً کوچ کر آئیں تو ہندوؤں کو سرائی کھلانے سے پہلے دبوچا جاسکتا ہے۔ خطرہ یہ ہے کہ ہندو مسلمانوں کو فوراً ہی قتل کرنا شروع نہ کر دیں۔ ہم فوج کو مردا سکتے ہیں لیکن یہ ہماری برداشت سے باہر ہو گا کہ کسی ہتھیار مسلمان کا خون بہہ جائے۔ ہمیں یہاں بچوں اور مسلمانوں کی حفاظت کرنی ہے۔ اگر ہندوؤں نے مسلمانوں پر حملے شروع کر دیئے تو وہ مسلمان خواتین کو اٹھالے جائیں گے، پھر تاریخ اقامت ہم پر لعنت کیجی رہے گی۔“

”ہمیں اب لاہور میں اپنی حکومت قائم کرنی پڑے گی۔“ سلطان محمود نے کہا۔ ”اور ہمیں بہت جلد کوچ کرنا پڑے گا۔“

✱

سلطان محمود نے اپنے سالاروں کو کوچ کی وجہ بتائی اور فوجی کوچ کے احکام دے کر کہا کہ کوچ بہت تیز ہو گا۔ پڑاؤ بہت کم ہوں گے۔ سوار اور پیادہ چلتے چلتے کچھ کھالیا کریں گے اور منزل کا بچھ ہو گا جہاں کے قطعے کا محاصرہ کر لیا جائے گا۔ محاصرے کے دوران فوج آرام کرے گی سلطان محمود نے سب کو نقشے پر کوچ کا راستہ دکھایا اور وہ جگہیں بتائیں جہاں پڑاؤ کرنے تھے۔ ان سے فارغ ہوا ہی تھا کہ اسرائیل سلجونی کا پیغام آ گیا۔ پیغام لانسولا کوئی دوسرا آدمی تھا۔ اُس نے اسرائیل کا پیغام زبانی دیا۔ اگر سلطان میری طاقت سے خائف ہو کر سلجونیوں کو وطن دے رہے ہیں تو میں ایسا وطن قبول کروں گا، اور اگر سلطان کو اپنی جنگی طاقت پر ناز ہے اور مجھے بھینک کے طور پر زمین کا خطہ دے رہے ہیں تو میں ایسا وطن قبول نہیں کروں گا۔ میں غزنی کی سلطنت کا خطیلا اتحادی بھی نہیں بنوں گا۔ میں اپنی قوم کے لیے خود ایک وطن حاصل کرنے کی طاقت رکھتا ہوں۔ مجھے سلطان کا جواب چاہیے کہ آپ مجھ پر

کیوں مہربان ہوئے ہیں۔ میں آپ کو پھر بتا دیتا ہوں کہ میرے پاس غزنی کی فوج کے ساتھ مکر لینے کے لیے کافی فوج ہے۔“
سلطان محمود کو سنسی آگئی اور بولا۔ ”اسرائیل سلجوقی میں جرأت بھی ہے اور طاقت بھی ہے لیکن اس میں عقل کی کمی ہے۔ اُسے کہنا کہ نہ میں اُسے کمزور سمجھتا ہوں نہ اپنے آپ کو۔ میں اس خطے میں امن قائم کرنا چاہتا ہوں ہماری آپس کی لڑائیوں سے کفارِ فاجرہ اٹھارے برس۔۔۔ اور اسرائیل سلجوقی کو میرا سلام دے کر کہنا کہ میں ہندوستان جارہا ہوں۔ میری واپسی کا انتظار کرے۔ میں ان علاقوں میں اس کی حیثیت کو تسلیم کرنا ہوں۔ میری غیر حاضری میں کوئی نقل و حرکت نہ کرے۔“

سؤرخ نکھتے ہیں کہ سلطان محمود کو یہ خدشہ نظر آ رہا تھا کہ اس کی غیر حاضری میں اسرائیل سلجوقی غزنی پر حملہ کرے گا۔ سلطان کو معلوم تھا کہ سلجوقیوں کی جنگی طاقت بہت زیادہ ہو گئی ہے اور وہ چھوٹے موٹے حکمرانوں سے تلوار کی نوک پر اپنی شرائط منوا سکتے ہیں۔ چنانچہ سلطان محمود نے اسرائیل کے ایلچی کو سبزی باری دکھا کر بتایا کہ وہ سلجوقیوں کی ہر شرط مانے گا۔ ایلچی نے واپس جا کر اسرائیل کو سبزی باری دکھائے۔ اسرائیل مطمئن ہو گیا اور اُس نے کہا کہ وہ سلطان محمود کی واپسی کا انتظار کرے گا۔

✽

یہ ۲۳-۱۰۲۲ عیسوی (۴۴۱ ہجری) کا واقعہ ہے کہ سلطان محمود غزنوی نے ایک بار پھر وہ برق رفتار پیش قدمی کی جس پر آج کے دور کے جنگی مہمیں اور مؤرخ جیران میں۔ اگر وہ راستہ دیکھا جائے جس راستے سے وہ کالجیہ پنجا تھا تو یقین نہیں آتا کہ اُس دور میں جب فوج گھوڑوں پر سوار ہوتی اور سپہیل بھی چلتی تھی اتنی زیادہ رکاوٹیں عبور کر کے یہ فوج اتنی تیز رفتاری سے آئی تھی وہ کالجیہ جانے کی بجائے پہلے گوالیار گیا جو ہمارا گذر گزادہ کے ایک طاقتور اتحادی بہاراج ارجن کی راجدھانی تھی۔ غزنی سے گوالیار تک اُسے کئی ایک

چھوٹے دریا عبور کرنے پڑے۔ صرف بڑے دریا گئے جائیں تو آٹھ مہینے ہیں۔ سندھ، بلخ، چناب، راوی، ستلج، گنگا، جمنا اور گہل۔ دریا گئے گہل گوالیار کے قریب سے گذرنا اور آگے جا کر جمنا میں شامل ہو جاتا ہے۔
گوالیار کا قلعہ آج بھی کھڑا ہے۔ یہ بڑی سخت چٹانوں پر تعمیر کیا گیا ہے اور اُس دور میں اسے بجا طور پر ناقابلِ تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ بہلا جارجن کو اُس وقت پتہ چلا کہ غزنی کی فوج آگئی ہے جب یہ فوج قلعے کو محاصرے میں لے چکی تھی سلطان محمود بڑے اچھے وقت پہنچا تھا۔ گوالیار اور کالجیہ کی فوجوں کو اکٹھے ہو کر سلطان محمود کا مقابلہ کرنا تھا لیکن دونوں فوجیں ابھی اپنی اپنی راجدھانیوں میں تھیں اور لڑنے کے لیے تیار نہیں تھیں۔

سلطان محمود نے دیکھ لیا تھا کہ اس قلعے کو مرکزِ ناہت ہی شکل ہے۔ جن چٹانوں پر یہ قلعہ تھا، ان پر پاؤں جھکا کر تھکنا بہت مشکل تھا۔ اس کے باوجود سلطان محمود نے فوج کو حکم دیا کہ پوری بلند آواز سے نعرے لگائے جائیں اور قلعے پر تہ بول دیا جائے۔ قلعے کی دیواروں سے تیروں کا عینہ برس رہا تھا مگر غزنی کے سپاہی آگے بڑھ کر دروازے توڑنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ دھاتوں کو سپاہیوں پر پھونک کر ان کے درمیان دھجیوں کے بہت بڑے بڑے تہ بنائے گئے۔ دھجی دوڑتے دروازے کی طرف جاتے اور تنوں کے اگلے میرے دروازے سے نکراتے مگر دروازے مضبوط تھے۔

تیراندازوں نے آگے جا کر قلعے کی دیواروں کے اوپر تیر بڑائے۔ تنکیر کے نعروں سے زمین و آسمان وہل رہے تھے۔ چار روز تک یہ کیفیت رہی پانچویں دن کا سورج طلوع ہوا تو قلعے پر سفید جھنڈا لہرا کر نظر آیا۔ سلطان محمود نے حکم دے دیا کہ لڑائی بند کر دی جائے۔ قلعے کی دیواروں سے اب کوئی تیر نہیں آ رہا تھا۔ قلعے کا دروازہ کھلا اور ایک بالکی اُٹھائی جسے چار آدمیوں نے کندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ یہ بالکی سلطان محمود کے سامنے اتاری گئی۔ اس میں سے ایک آدمی باہر آیا جو مہاراج کے دربار کا مظلوم ہوتا تھا۔ وہ ایلچی تھا اور صلح کا پیغام

(ساراج ارجن) کے پاس گیا تو چاندی کے تخت پر ایک بڑا ہی خوب رو جوان بیٹھا تھا۔ اُس کے گھرے سانفے رنگ میں بھی جُن تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ میں وہ لباس لایا ہوں جو آپ کو پہننا ہے اور اپنی انگلی کا ٹی ہے۔ اُس نے مجھے کہا کہ اپنے سلطان سے کہ دینا کہ میں نے آپ کا بھیجی ہوا لباس پہن کر انگلی کا ٹی ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ میں اپنے سلطان کو دھوکہ نہیں دوں گا۔ آپ کو ہمارا لباس پہننا پڑے گا

اُس نے بادل خواست ہمارا لباس پہن لیا اور کمر کے ساتھ ہمدی تلوار باندھ لی۔ مجھے اُس کی بے بسی پر ترس آ گیا۔ میں اُسے کہنا نہیں چاہتا تھا کہ وہ اپنی انگلی کا ٹی۔ اُس نے خود ہی ایک ملازم سے کہا کہ اُسٹراے آؤ۔ اُسٹراے آؤ اُس نے اس سے اپنے بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی کے تین حصوں میں سے اوپر والا حصہ بڑے اطمینان سے کاٹ دیا۔ میں نے اُس کے چہرے پر درد کا اظہار کیا تاثر بھی نہ دیکھا۔ اُس نے کٹی ہوئی انگلی ایک دوائی میں ڈال دی پھر اس پر ایک سفوف چھڑکی ٹپی باندھ دی۔ اُس نے انگلی کا ٹی ہوا حصہ ایک کپڑے میں لپیٹ کر مجھے دے دیا اور رسم کے مطابق اُس نے مجھے پیش قیمت کپڑے، چاندی اور دودھ پڑے دیئے۔

اُس وقت کے ایک اور مؤرخ سبط ابن الجوزی نے یہی واقعہ لکھا ہے اور اس نے یہ اضافہ کیا ہے کہ سلطان محمود کے پاس کٹی ہوئی انگلیوں کے بہت سے ٹکڑے تھے۔ یہ ہندو ساراجوں کی رسم تھی کہ جس سے شکرت کھاتے اُسے اپنی چھوٹی انگلی کا اوپر والا حصہ کاٹ کر دے دیتے تھے۔

✱

سلطان محمود نے ساراج ارجن کو اپنے تابع کر کے کالنج کاشخ کیا۔ کالنج کاشخ کا قلعہ بہت وسیع و عریض تھا۔ اس کے اندر کی آبادی پانچ لاکھ سے زیادہ تھی۔ میں ہزار مولیٰ اور پانچ سو ہاتھی تھے۔ سلطان محمود نے اس قلعے کا محاصرہ اس طرح کیا کہ قلعے کے اندر والے والے تمام راستے بند کر دیئے۔

لایا تھا۔ وہ اپنے ساتھ تحفے کے طور پر پینتیس ہاتھی لایا تھا۔ ساراج ارجن کے اس ہاتھی اور سلطان محمود کے درمیان ایک ترجمان کے ذریعے جو باتیں ہوئیں، وہ ایک دستاویز میں محفوظ ہیں۔ یہ شام کی قدیم زبان میں لکھی ہوئی ہے اور اس کا ترجمہ ڈاکٹر اے۔ ایس۔ ٹرائیٹون نے انگریزی میں کیا ہے۔ ڈاکٹر موصوف علی گڑھ یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر رہ چکے ہیں۔ اس کا ترجمہ یوں ہے:

”سلطان محمود غزنوی نے قلعے (گوالیار) پر ایسے طوفانی بے ہوشی کے چار روز بعد ساراج (ارجن) کا ایک سفیر یا کئی میں باہر آیا۔ بالکی چار آدمیوں نے اٹھا رکھی تھی۔ سفیر نے سلطان محمود سے پوچھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں اور ہم پر حملے کا مقصد کیا ہے سلطان نے کہا: میں مسلمان ہوں۔ میں آپ کو کافر سمجھ کر دھوکہ دیتا ہوں کہ بت پرستی ترک کر کے خدا کی عبادت کریں جس طرح ہم کرتے ہیں۔ آپ ہمارا شرعی قانون تسلیم کریں اور گائے کو بوجھنے کی بجائے اس کا گوشت کھائیں۔ سفیر نے کہا: ہم گائے کا گوشت نہیں کھا سکتے۔ آپ اپنا کوئی عالم ہمارے پاس بھیجیں جو ہمیں بتائے کہ آپ کا مذہب کیا ہے۔ اگر یہ ہمارے مذہب سے بہتر ہو تو ہم اسے قبول کر لیں گے۔“

سلطان محمود نے فوج کے ایک امام کو قلعے میں بھیج دیا۔ شام کو امام ہاراج کا یہ جواب لے کر باہر آیا کہ ہم آپ کا مذہب قبول نہیں کر سکتے۔ ہم آپ کو تین سو ہاتھی اور کئی من چاندی پیش کرتے ہیں۔ آپ محاصرہ اٹھالیں۔ سلطان محمود نے پیغام بھیجا: مجھے منظور ہے لیکن اس شرط پر کہ آپ ہمارا لباس پہنیں اور ہماری طرح کمر کے ساتھ تلوار باندھیں اور ہندوستان کی رسم کے مطابق اپنے ایک ہاتھ کی سب سے چھوٹی انگلی کا اٹھارہ کاٹ کر میرے حوالے کر دیں تاکہ مجھے اعتبار آجائے کہ آپ صلح چاہتے ہیں اور آئندہ میرے خلاف نہیں لڑیں گے۔“

”سلطان محمود کا جو سفیر (نام نہیں لکھا) پیغام لے کر ساراج ارجن کے پاس گیا، اُس کا بیان ہے: میں جب ہندوستان کے اس بادشاہ

یہ دراصل مضبوط دیواروں کے اندر بہت بڑا شہر تھا۔ سلطان نے ماراج گنڈہ کے لیے بیغام بھیجا جو قلعے کے صدر دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر قاصد نے بلند آواز سے دیا :

”ہم آپ کو خبردار کرتے ہیں کہ قلعے کے اندر ہم کسی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اپنی مخلوق کا قتل عام نہ کرائیں۔ ہم آپ کو دعوت دیتے ہیں کہ اسلام قبول کر لیں یا ہماری شرائط پر تادان اور جزیہ ادا کریں۔“

پچھلے چند دن ماراج گنڈہ ڈھار مارا سلطان محمود کی فوج لے لہ بولا تو بہدر نے صلح کی خواہش ظاہر کر دی لیکن اسلام قبول نہ کیا۔ وہ سالانہ رقم مقرر کر کے غزنی کا باغ گزار ہو گیا اور اُس نے تین سو ماہی پیش کیے۔ سلطان محمود نے گنڈہ کو بھی غزنی کا لباس بھیجا کہ وہ پہن کر اپنی چھوٹی اٹھلی کاٹ دے۔ گنڈہ نے یہ شرط قبول کر لی اور اپنی اٹھلی کاٹ کر بھیج دی۔

یہاں ماراج گنڈہ نے سلطان محمود کے ساتھ ایک مذاق کیا۔ مؤرخ لکھتے ہیں کہ گنڈہ نے تین سو ماہی مادیاتوں کے بغیر قلعے سے نکالے اور سلطان کو بیغام بھیجا کہ اگر آپ کی فوج اتنی بہادر ہے تو ان ماہیوں کو پکڑے سلطان محمود مان گیا۔ ماہی باہر آئے تو وہ بدستی میں جھپٹے چنگھاڑے ادھر ادھر بھاگنے پھڑنے لگے معلوم ہوا کہ ان ماہیوں کو کوئی نشانہ پلایا گیا ہے جس سے یہ مسموم آگے چلے جانے لگے۔ تین سو ماہیوں نے غزنی کی فوج میں قیامت مپا کر دی سلطان محمود نے حکم دیا کہ بہترین گھوڑ سوار ان ماہیوں کو خیمہ گاہ سے نکالیں یا انہیں تیروں اور برہمنوں سے ہلاک کر دیں۔

سلطان محمود کی فوج میں ایک تاتاری دستہ بھی تھا (بعض مؤرخوں نے اسے ترک دستہ کہلاتے)۔ انہوں نے ہلاکار کر کہا کہ ہم ہندوؤں پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتے کہ ہم ان کے ماہی پکڑ نہیں سکتے۔ چنانچہ بہت سے تاتاری (یا ترک) گھوڑوں پر سوار ہوئے اور بڑی ہی مشکل اور غیر معمولی دلیری سے انہوں نے تمام ماہیوں پر قابو پالیا۔ قلعے کی دیواروں سے ہندوؤں نے داد و تحسین کے لہجے

بلند کیے۔

ماراج گنڈہ سے بہتر مارا لو کہ سلطان لاہور پہنچا۔ وہاں کا ماراج تریلوچن بال وہاں سے بھاگ کر اجیر چلا گیا۔ سلطان محمود نے لاہور میں اپنی حکومت قائم کر دی اور لاہور میں اپنا پہلا گورنر مقرر کیا۔ یہ تھا ایاز جسے سلطان محمود اس لیے بہت چاہتا تھا کہ اُس میں غیر معمولی ذہانت تھی اور سلطان اس کے متبر سے بہت متاثر تھا۔

سلطان محمود لاہور میں بہت سی فوج چھوڑ کر ماراج، اپریل ۱۰۲۳ء میں غزنی واپس چلا گیا جہاں اسرائیل سلجوقی اُس کی سلطنت کے لیے تشویش کا خطرہ بن چکا تھا۔

سومنات کے دروازے پر

میں سلطنت غزنی کا پہلا گورنر مقرر کر کے جب
لاہور سلطان محمود غزنوی غزنی پہنچا تو وہ اُس طرح
مسرور اور مطمئن نہیں تھا جس طرح وہ ہندوستان پر ہر حملے کے بعد ہوا کرتا تھا،
حالانکہ اب کے اُس نے ہندوستان کے وسط میں جا کر وہاں کے تین بڑے ہی
طاقتور رہبراجوں کو شکست دی اور اُس نے اپنے بدترین دشمن ہماراج لاہور
کی قسمت سر ہم کر کے وہاں اپنا گورنر مقرر کر دیا تھا۔ اس کی یہ کامیابی غیر معمولی تھی
مگر وہ خوش نظر نہیں آتا تھا۔

اُس کے سمت راست تاریخ ساز سالار ابو عبد اللہ محمد الطائی نے
اُسے چند دن دیکھا، آخر ایک روز پوچھا کہ وہ کیوں پریشان سا لگ رہا ہے۔
سلطان نے ہلکی سی مسکراہٹ سے وجہ بتائی۔ اُس کی عمر پچیس برس ہو چکی تھی جسے
وہ بڑھاپے کی عمر نہیں سمجھتا تھا لیکن وہ جسم میں کمزوری سی محسوس کرنے لگا تھا۔
تھکن بھی جلدی ہو جاتی تھی۔

سالار ابو عبد اللہ نے اُسی وقت سلطان کے ذاتی طبیب کو بلایا۔ طبیب نے
سلطان کی نبض دیکھی۔ کچھ پوچھا۔ دل کی دھڑکن محسوس کی اور کہا کہ طویل آرام کی
ضرورت ہے۔ اعصاب بہت جھک گئے ہیں۔ جسم میں بیماریوں کے خلاف
مداغت کی صلاحیت کمزور ہو گئی ہے۔ اگر سلطان نے اعصاب کو آرام نہ دیا تو
کسی وقت کوئی معمولی سی بیماری بھی جاں لیوا ثابت ہو سکتی ہے۔

”میں آرام کی حالت میں نہیں مرنا چاہتا“ سلطان محمود نے کہا۔ ”موت سے
میری ملاقات بستر پر نہیں ہونی چاہیئے۔ میں اپنے جسم کو آرام نہیں دے سکتا۔
جسم کو خاک میں مل جانا ہے۔ اس کی طاقت کم ہو گئی تو میں رُوح کی قوت سے
وہ فرض ادا کروں گا جو خدا نے ذوالجلال نے مجھے سونپا ہے۔ شیخ الاسفند
مجھے یہ بتائیے کہ میری رُوح کو علیل نہیں؟“

”نہیں“ طبیب شیخ الاسفند نے جواب دیا۔ ”میں آپ کو صحیح بات بتا دیتا
ہوں۔ میں نے آپ کو آپ کی جسمانی کمزوری بہت کم بتائی ہے۔ آپ کا جسم کوج،
محاصروں اور جنگ کے قابل نہیں رہا۔ آپ روحانی قوت سے لڑ رہے ہیں۔“
”میرے پیر و مرشد شیخ ابوالحسن خرقانی اسے ایمان کی قوت کہا کرتے ہیں۔“
سلطان محمود نے کہا۔ ”جسم اتنا ہی کمزور ہوتا ہے جتنا انسان سمجھتا ہے۔ کمزوری
اور درد ایک احساس کے دو نام ہیں۔ آپ درد کو جتنا شدید سمجھنا چاہتے ہیں
درد اتنا ہی شدید ہوگا۔ مجرم شیخ! میں آپ کو نہیں بلانا چاہتا تھا۔ ابو عبد اللہ
نے آپ کو میرے لیے بلایا ہے۔“

”آپ نے جسمانی کمزوری کا ذکر کیا تھا اس لیے میں نے انہیں بلانا ضروری
سمجھا“ ابو عبد اللہ نے کہا۔ ”جسمانی کمزوری اچھی نہیں ہوتی۔“

”میں کچھ اور محسوس کر رہا ہوں۔“ سلطان محمود نے کہا۔ ”مجھے ایک آخری
بہم سُر کرتی ہے۔ مجھے اپنی رُوح سے ابتداء سے مل رہے ہیں کہ مجھے جو کچھ
کرنا ہے جلدی جلدی کر لوں۔ ہندوستان کے بہت مجھے راتوں کو لٹکار کے ہیں۔
ڈرتا ہوں کہ اپنا فرض مکمل کرنے سے پہلے دنیا سے اٹھ جاؤں گا۔ مجھے فوجی طاقت
چاہیئے۔ ہماری طاقت بھری ہوئی ہے۔ مجھے ان سرداروں، امیروں اور بھرانوں
کو متحد کرنا ہے جو میری غیر حاضری میں غزنی کے لیے خطرہ بن جاتے ہیں۔ مجھے
محسوس ہونے لگا ہے کہ میری عمر تھوڑی رہ گئی ہے اور میں اپنا فرض ادا نہیں کر
سکا۔“

سالار ابو عبد اللہ محمد الطائی نے سلطان محمود کو جذبات سے نکال لیا اور دونوں

”جو سلطان چوآن ہزار بہترین گھوڑ سوار اور ایک ہزار تین سو گھوڑی ہاتھی جن کے بہادریوں سے بڑھیاں اور تیر برستے ہیں، اپنے ساتھ لایا ہے، اُس کے ارادے

*

تمام مرد عین نے لکھا ہے کہ اتنی ہیبت ناک جنگ قوت دیکھ کر چھوٹے موٹے اہل
اور والی بیش قیمت تحفے کر سلطان محمود کے استقبال کو آ گئے۔ اُس نے ان
کے تحفے اور دوستی کو قبول کر کے انہیں کہا کہ وہ انہیں دیرپا سچوں کے پار کسی
جگہ ایک ضیافت میں مدعو کرے گا اور وہاں بتائے گا کہ اس کا ارادہ کیا ہے اور وہ
کیا چاہتا ہے۔

بکھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی چاہیے۔" اپنی نے کہا۔ "آپ کا غرور دست
قدرخان سلطان کی اطاعت قبول کر چکا ہے۔ میں یہ امید لے کر آیا ہوں کہ آپ
اپنی فوج کا قتل عام نہیں کرائیں گے۔"
"قدرخان بڑا دل ہے۔" حسین ملک نے کہا۔ "تمہارے سلطان کا مقابلہ ایک
طاقتور بادشاہ کے ساتھ ہے۔"

"ملکہ عالیہ!" اپنی نے کہا۔ "یہ عورتوں کی لڑائی نہیں۔ بلخ و سمرقند کے
بادشاہ سے مخاطب ہوں۔ مجھے حکم ملتا ہے کہ جواب لے کر آؤں کہ آپ سلطان کی دعوت
قبول کرتے ہیں یا نہیں۔"

"ہم آمیں گے۔" الینگین نے دو لوگ اپنے میں جواب دیا۔ "لیکن ہم یہ
فیصلہ کر کے نہیں آئیں گے کہ ہم غزنی کی اطاعت قبول کرتے ہیں یا نہیں۔"

اور وہ سلطان محمود غزنوی کی ضیافت میں آگیا۔ اس کے ساتھ اس کی ملکہ نہیں
تھی۔ وہ چند ایک محافظوں کو اپنے ساتھ لایا تھا۔ محمود غزنوی نے نہایت خوبصورت
جنگل میں ضیافت کا انتظام کیا تھا۔ ضیافت کے بعد سلطان نے سب کو الگ بٹھا لیا۔
اُس کے ساتھ اُس کے سالار تھے اور اُس کے ساتھ اس کا ایک اور مشہور
سالار سلطان جاذب بھی تھا جو اُس وقت خوارزم کا گورنر تھا۔ وہ دو لوگ فیصلہ
کرنے والا اور دشمن کے خلاف انتہائی قدم اٹھانے والا سالار تھا۔ اُس کا
اھوار تھا کہ دشمن پر رحم کرنا اپنے آپ کو شکست کے راستے پر ڈالنے کے مترادف
ہوتا ہے۔

"میرے دوستو! دو سو تین سبط ابن الجوزی اور ابن الاثیر کے مطابق
سلطان محمود نے ان سب سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔ "آپ سب نے میری
جنگی طاقت دیکھ لی ہے۔ میں تیرہ سو تھالی لایا ہوں۔ بارہ سو غزنی میں ہیں۔
گھوڑے سواروں کا یہ لشکر اُس کا نصف ہے جو میں نے اپنی سلطنت میں جگہ جگہ رکھا
ہوا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں زیادہ فوج ساتھ نہیں لایا کیا یہ فوج آپ سب
کو تہ تیغ کر لے کے لیے کافی نہیں؟ لیکن میں آپ کو اپنی جنگی طاقت سے نہیں

خلفے کو مارنے آیا ہوں۔ خدا نے مجھے طاقت صرف اس لیے دی ہے کہ میں اُس کی
راہ میں جہاد کر رہا ہوں۔ آپ مجھے ہندوستان کا ایثار اور دولت کا بچا رہتے ہیں۔
اگر میں ایسا ہی ہوتا تو میرے پاس اتنی دولت اور اس قدر سونا ہے کہ میں باقی عمر آرام
سے عیش و عشرت میں گزار سکتا ہوں اور میری تین لکھیں بھی عیش کر سکتی ہیں مگر میں دیکھ
رہا ہوں کہ میرا جہاد مکمل نہیں ہوا۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ میری ساری عمر کج و
جنگ کرتے گزری ہے اور میں کل میں نہیں میدان جنگ میں رہنا چاہتا ہوں میرے
غزانے ہیں رہ جائیں گے اور میری لاش ہندوستان کی مٹی میں دفن جائے گی۔۔۔۔
"آپ سب میرے خلاف ہیں لیکن آپ کا آپس میں بھی اتحاد نہیں۔ آپ حکمرانی
کے شیلی ہیں۔ کیا آپ چین کی زندگی بسر کر رہے ہیں، اسی لیے آپ سب کے دلوں پر
خوف طاری رہتا ہے۔ آپ نے اللہ کے بندوں کو اپنی رعایا اور اپنا غلام بنا کر رکھا ہے۔
مہتمم الینگین والی بلخ و سمرقند ہم میں موجود ہیں۔ میں سن رہا ہوں کہ یہ اپنی رعایا پر
ظلم و تشدد کرتے ہیں اور کوئی ایک بھی انسان ان سے خوش نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ
حکمرانی دل کو تنگیں اور مارا کو نشہ دیتی ہے۔ آپ میں کچھ ایسے بھی ہیں جو مذہب کا
دھوکہ دے کر حکومت کر رہے ہیں۔ ایسے حکمران اپنی رعایا کے سامنے اپنے الفاظ
میں زاہد اور پارسا بنے رہتے ہیں لیکن وہ بھول رہے ہیں کہ اُن کے اوپر ایک
طاقت ہے جو صرف اُن کا نہیں، ساری دنیا کا تختہ الٹ سکتی ہے۔ یہ دنیا اُسی
طاقت کے حکم سے وجود میں آئی ہے۔ رعایا پر ظلم، رعایا کو انسان نہ سمجھنا، خدا کے
بندوں کو خدا کے پیچھے مذہب کا دھوکہ دینا ایسے گناہ ہیں جو خدا انصاف نہیں کرتا
.... اور آج خدا نے مجھے آپ کے سر پر بھیج دیا ہے۔۔۔۔

"میں آپ کو بڑے صاف الفاظ میں بتانا ہوں کہ میں آپ کو اپنا غلام بنانے
نہیں آیا۔ میں آپ کی زمینوں پر قبضہ کرنے نہیں آیا۔ میں آپ کو یہ بتانے آیا
ہوں کہ یہ زمین اللہ کی ہے اور اسی زمین پر ہر انسان کا خواہ وہ کتنا ہی ادنیٰ
ہے اتنا ہی حق ہے جتنا ایک بادشاہ کا، ایک سلطان کا اور ایک امیر کا ہے۔ میں
آپ کو اسلام کے نام پر مجھ کرنے آیا ہوں۔ میں آپ میں سے کسی کو بھی میدان جنگ

میں نہیں لے جاؤں گا۔ یہ فرض میں اپنے ذمے رکھتا ہوں۔ مجھے ہندوستان کو اسلامی سلطنت بنانا ہے۔ ہندوستان مسلمانوں کا ہے۔ ہندوستان ان شہیدوں کا ہے جو محمد بن قاسم کے ساتھ لہرے لگاتے آئے تھے اور شہید ہو گئے۔ آج ان کی ہڈیوں کی خاک پر بیت خانے تعمیر ہو گئے ہیں۔ وہاں مسجدیں دیوان ہونگی ہیں۔ وہاں اسلام کی بیٹیوں کی عصمتیں لٹ رہی ہیں۔ وہاں اسلام کا چراغ ٹٹن رہا ہے۔۔۔

”میرے بھائیو! میں ایک عقیدے کی جنگ لڑ رہا ہوں۔ ذرا دور آگے مستقبل میں جھانکیں۔ اگر ہم نے ہندو کا ڈنک پوری طرح نہ مارا اور اس باطل مہاسب کو جڑوں سے نہ اکھاڑا تو ہندوستان مسلمانوں کا مذہبہ خانہ بنا رہے گا۔ وہاں کی مسجدیں اصل بن جائیں گی۔۔۔

”آپ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ آج تک آپ نے اپنے کان، اپنی آنکھیں اور اپنے دماغ بند رکھے۔ آج میں انہیں کھولنے آیا ہوں۔ آپ کے سامنے دوراستے ہیں۔ ایک یہ کہ آپ سب اپنی اپنی فوج کا نصف حصہ مجھے دے دیں جو مجھے ہندوستان لے جانا ہے اور آپ سب ایک عہد نامہ کریں کہ آپ میری غیرحاضری میں غزنی کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھائیں گے بلکہ غزنی کی پاسبانی کریں گے۔ دوسرا یہ ہے کہ میں آپ سب کو گرفتار کر لوں اور آپ کی رہائشوں اور جاگیروں کو اپنے قبضے میں لے لوں۔ خدائے ذوالجلال نے مجھے اتنی طاقت دی ہے کہ میں اپنا یہ ارادہ پورا کر سکتا ہوں۔“

سلطان محمود خاموش ہو گیا اور اُس کی نظریں سب پر گھومنے لگیں۔ جس کسی کو میری شرط منظور نہیں وہ ہاتھ کھڑا کر دے۔“ سلطان محمود نے کہا۔

کسی ایک نے بھی ہاتھ نہ اٹھایا۔ سلطان محمود نے سب کو حراج بخش پیش کیا اور کہا کہ کل عہد نامہ تحریر ہو گا اور ہر ایک کی اس پر نہر لگوائی جائے گی۔

✱

اگلی صبح سلطان محمود نے نماز سے فارغ ہوتے ہی عہد نامہ تحریر کرایا اور سب کو بلایا۔ اُسے اطلاع دی گئی کہ سرنندویش کا حکمران الینگین غیر حاضر ہے۔ ذرا سا سزا

یہ ملا کہ سحر کی تاریکی میں چند گھوڑے فلاں سمت جاتے دیکھے گئے تھے۔ سلطان کے حکم سے سوار دوڑا دیئے گئے بہنوں نے اُسے راستے میں جالیا۔ اُس کے ساتھ حافظ تھے۔ اُس نے ہاتھوں کو مقابلے کا حکم دیا لیکن غزنی کے سواروں کی تعداد زیادہ تھی۔ ان کی لٹاکار پر ہاتھوں نے مقابلے کی عزت نہ کی۔ الینگین کو واپس لے آئے اور سلطان کے سامنے لاکھڑا کیا۔

”کیا تم خدائی گرفت سے بھاگ سکتے ہو؟“ سلطان محمود نے کہا۔ ”میں اپنی اطا کا نہیں خدائی اطاعت کا بیخام لے کر آیا تھا۔ تمہارے بھاگنے کا سبب کیا ہے؟“

”میں غزنی کی اطاعت قبول نہیں کروں گا۔“ الینگین نے جواب دیا۔

سلطان محمود نے حکم دیا۔ ”اسے اسی وقت زنجیروں میں باندھ کر ہندوستان بھیج دو اور ملتان کے قلعے میں قید کر دو۔ یہ باقی عمر وہیں گزارے گا۔“

اُس کی باقی عمر ملتان کے قلعے کی ایک کوٹھڑی میں گزری۔

باقی سب نے عہد نامے پر دستخط کر دیئے۔ سلطان محمود ابھی ادھر سے فارغ ہوا ہی تھا کہ اُسے اطلاع دی گئی کہ اسرائیل سلجونی آگیا ہے۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، وہ سلجونیوں کا بے تاج بادشاہ تھا۔ اُس کا کوئی ملک نہیں تھا لیکن چھوٹی ٹٹونی ریاستوں پر اُس کی دہشت طاری تھی۔ اُس کی فوج کراٹے پر لی جاتی تھی۔ سلجونیوں کے علاوہ کئی اور خانہ بدوش اور جنگلوں میں رہنے والے قبائل اُس کے ساتھ جا ملے تھے۔ اس طرح اُس کے لشکر کی تعداد لاکھوں ہو گئی تھی۔ یہ ساری تعداد جو بھٹی اور بے حد دلیر۔

اسرائیل سلطان محمود کو اپنی وفاداری پیش کرنے آیا تھا۔ وہ ایک بار سلطان محمود سے شکست کھا چکا تھا اور اُس کی ایک بڑی ہی تباہ کن زمین ووز کارروائی ناکام ہو چکی تھی۔ اُس نے دیکھ لیا تھا کہ سلطان محمود اب جو جنگی طاقت لایا ہے، اس کا وہ مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ سلطان محمود کی جنگی چالوں اور اس کی فوج کے قدر سے وہ پہلے ہی واقف تھا۔ وہ آیا تو وفاداری پیش کر لے تھا لیکن اُس دور کی کتاب طبقات ناصری میں لکھا ہے:

”وہ (اسرائیل) ترکمانیوں کے ایک دستے کے آگے آگے آ رہا تھا۔ اُس نے اپنے سر پر ٹوپی ڈیڑھی رکھی ہوئی تھی جو اُس کی رعوبت اور شجاعت کا اظہار کرتی تھی اور اُس کی گردن اکڑی ہوئی تھی جیسے وہ کسی سے ڈرنے والا نہیں۔“ اسی تحریر میں اُس کے متعلق لکھا ہے ”وہ جب کسی کے تعاقب میں ہوتا یا کسی کے خلاف لڑتا ہوتا تو وہ طوفانی بگولے اور گڑگڑتی ہوئی گھٹاکی مانند ہوتا تھا۔ اُس کے منہ میں جو آمادہ ہمیشہ کے لیے میٹ جاتا تھا۔ فضا میں اڑتا ہوا کوئی پرندہ اور جنگل میں دوڑتا کوئی ہرن اُس کے تیر سے بچ کر نہیں جا سکتا تھا۔“

وہ سلطان محمود سے ملا۔ سلطان محمود نے اُس کے ساتھ دہی باتیں کیں جو وہ دوسروں سے کر چکا تھا۔ اسرائیل نے سلطان کی اطاعت قبول کر لی جب سلطان نے اُس سے پوچھا کہ وہ کتنی فوج دے سکتا ہے تو اُس نے جو جواب دیا، وہ لفظ بلفظ ”تاریخ میں محفوظ ہے۔ مشہور مؤرخین نے لکھا ہے :

”اسرائیل نے اپنی ترکش سے ایک تیر نکال کر سلطان محمود کو دیا اور کہا۔ ”اگر آپ یہ تیر شمال کی طرف چھوڑ دیں تو پچاس ہزار ترکمانی جنگجو آپ کے پاس آجائیں گے۔ اگر آپ کو مزید فوج کی ضرورت ہو تو دوسرا تیر کہ بلخان کی طرف چھوڑ دیں تو پچاس ہزار مزید لشکر گھوڑوں پر سوار ہو کر آپ کے پاس آجائے گا۔“ سلطان محمود نے اُسے کہا۔ ”اگر مجھے آپ کی ساری فوج کی ضرورت پڑے تو ب۔“ اسرائیل نے کہا۔ ”میری کمان اپنے قاصد کے ہاتھ پہنچ دیں جو وہ تمام علاقے میں کھاکر واپس آجائے۔ آپ کے پاس دو لاکھ فوج آجائے گی۔“ سلطان محمود کو اسرائیل کی نیت پر کچھ شک ہوا۔“

دوسرے مؤرخین جن میں گردیزی، گزیدہ، ابن الاثیر اور ایک کتاب ”مجموع الانصاف“ قابل ذکر ہے، اس واقعہ پر متفق ہیں۔ ان سے شہادت ملتی ہے کہ سلطان محمود نے اسرائیل کو اُس کے خیمے میں بھیج دیا اور اُس کی خاطر تواضع کا حکم دیا۔ وہ چلا گیا تو سلطان نے اسرائیل کے متعلق مزید معلومات فراہم کیں۔ قدر خان نے بتایا کہ سلجوقی سب کے لیے مصیبت بنے ہوئے ہیں۔ ان سے دفا داری کی توقع نہیں رکھی جا

سکتی۔ سلطان کے اپنے سالار ارسلان جاذب نے بھی سلطان کو بتایا کہ سلجوقی بمکی اخلاق اور ضابطے کے پابند نہیں۔

نحوہ سلطان محمود اسرائیل کا اندازہ اُس کی ڈیڑھی ٹوپی دیکھ کر شک میں پڑ گیا تھا۔ اُس نے حکم دیا کہ اسرائیل کو گرفتار کر کے شہر کے قلعہ کا بچر (موجودہ کوٹلی) میں قید میں ڈال دیا جائے۔ اُسی وقت اسرائیل کے ہاتھوں میں پہنکے ڈال اور پاؤں میں زنجیریں ڈال کر شہر کو روانہ کر دیا گیا۔ مورخوں کے مطابق، وہ سات سال اس قلعے میں رہ کر وہیں مر گیا۔ اُس نے ایک بار فرار کی کوشش کی تھی۔ قلعے سے نکل بھی گیا تھا لیکن برفانی علاقے میں دھڑ نہ جاسکا اور پڑ گیا۔

اُسے جب زنجیریں ڈال کر لے جایا جانے لگا تو اُس کے ساتھ ترکمانیوں کا جو دستہ آیا تھا وہ قریب ہی کھڑا تھا۔ اسرائیل سلجوقی نے بلند آواز سے اپنے دستے سے کہا۔ ”نھارا فرض ہے کہ غزنی کی اینٹ سے اینٹ بجا دو۔“

سلطان محمود نے کسی وقت سلجوقیوں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ انہیں آزاد نہیں دے گا۔ اب اُس نے حکم دیا کہ سلجوقیوں کو دیئے جیوں اور دریائے زرافشان کے درمیان کا علاقہ دے دیا جائے اور انہیں فوراً وہاں لایا جائے۔ چنانچہ سلجوقیوں کے چار ہزار کھنٹے اس خطے میں آ گئے۔ ان کے آگے تک سلطان محمود وہیں رہا۔ اُس نے ترکمانیوں اور ترکستانیوں کو الگ کر لیا اور انہیں کہا کہ وہ غزنی کی فوج میں آجائیں۔ مورخ لکھتے ہیں کہ یہ پہلا موقع تھا کہ ترکمان اور ترکستان کے لوگوں نے سلطان محمود کو دیکھا اور اس کی باتیں سُنیں۔ سلطان نے اپنی فوج کے بہت سے آدمیوں کو اس کام پر لگا دیا تھا کہ وہ ان لوگوں میں اٹھیں بیٹھیں اور انہیں بتائیں کہ سلطان محمود کا عزم اور ایمان کیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے ترکستانی اور ترکمانی غزنی کی فوج میں شامل ہو گئے۔

سلطان محمود کی یہ ہم کامیاب رہی۔ اب وہ سکون سے ہندوستان کے متعلق سوچ سکتا تھا۔

ہندوستان کے مغربی ساحل پر گجرات واقع ہے۔ اس کا ایک مشہور شہر کاٹھیاواڑ بالکل ساحل پر ہے۔ اس کے مشرق میں جنوب میں سونمات کا شہر ہے۔ وہاں بھارتی حکومت نے آزادی کے بعد ایک مندر تعمیر کیا ہے جو ایک بہت بڑے قدیم مندر کے کھنڈرات پر کھڑا ہے۔ سلطان محمود غزنوی کے زمانے میں اس ساحل علاقے میں بہت سے مسلمان آباد تھے۔ اسی علاقے میں احمد آباد کا شہر ہے جسے آج بھی ہندو چھوٹا پاکستان کہتے ہیں۔ یہاں مسلمانوں کی تس و غارت ہوئی ہی رہتی ہے۔ ۱۹۶۹ء میں یہاں ہزاروں مسلمانوں کو ہندوؤں نے شہید کر دیا تھا۔ ان کے بچوں کو زندہ جلایا اور مسلمان خواتین کی آبروریزی وسیع پیمانے پر کی گئی۔ احمد آباد مسجدوں کی بدولت زیادہ مشہور ہے۔

کراچی اور اس سے نیچے، تمام ساحلی علاقے میں مسلمان آبادی اکثریت میں رہی ہے۔ ابتدا میں یہ مسلمان عرب سے محمد بن قاسم کے ساتھ آئے تھے۔ ان میں کچھ ہمیں آباد ہو گئے۔ حوینات اُس زمانے میں اور بہت عرصہ بعد تک مشہور متوجہ بندر گاہ رہی ہے۔ عرب تاجروں کے بحری جہاز اسی بندر گاہ میں لنگر انداز ہوا کرتے تھے۔ ہندوستان سے ان کی تجارت یہیں سے ہوئی تھی۔ آہستہ آہستہ یہاں مسلمانوں کی آبادی بڑھتی گئی۔ سلطان محمود کے زمانے میں بھی یہاں مسلمان آبادی خاصی تھی۔ سونمات بہت بڑا مندر تھا تمام ہندوستان سے ہندو یہاں آتے تھے۔

یہاں کا مہاراجہ کنور رائے تھا جو مسلمانوں پر بہت ظلم کرتا تھا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ ہر صبح ایک مسلمان کو سونمات کے مندر کے دروازے پر رنج کیا جاتا تھا۔ وہاں کے لوگوں نے لکھا ہے کہ ہر روز نہیں بلکہ ہر چاند کی پہلی رات ایک مسلمان کو پکڑ کر سونمات کے دروازے پر قربان کیا جاتا اور اس کے خون سے بتوں کے پاٹوں اور مندر کی دیواریں دھوئی جاتی تھی۔

یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سونمات کے متعلق جو تفصیلات مختلف کتابوں میں آئی ہیں، بیان کر دی جاتیں۔ یہ دلچسپ بھی ہیں امدان سے ہندو مت کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے بلکہ ان معلومات سے ہندوؤں کا مذہب بے نقاب ہو کر اصل روپ

میں سامنے آ جاتا ہے۔ یہ سرائے گجرات سے بھی نہیں لڑتا کہ سونمات کا مندر کب تعمیر ہوا اور کس نے تعمیر کیا تھا۔ ہندوؤں کی کتابوں میں یہ روایت ملتی ہے (اولا سے ہندو اپنے مذہب کا حصہ سمجھتے ہیں) کہ چاند دیوتا نے ایک برہمن پر جاپتی کی بیٹیوں کے ساتھ شادی کی بیٹیوں کی تعداد کا کچھ پتہ نہیں۔ ان میں روہنی نام کی بیٹی سب سے زیادہ خوبصورت تھی۔ چاند دیوتا اسی کو زیادہ چاہتا اور اُس کی نظر کریم اسی پر تھی۔ پر جاپتی نے چاند دیوتا سے کہا کہ وہ اس کی سب بیٹیوں کے ساتھ ایک جیسا سلوک کرے۔ چاند دیوتا نہ مانا۔ پر جاپتی نے اُسے بدو عادی جس سے چاند دیوتا کو لڑھکی ہو گیا۔

اس روایت سے یہ ثابت کیا گیا کہ برہمن اتنی اونچی ذات ہے جو دیوتاؤں پر بھی حکم چلا سکتی ہے۔ بہر حال چاند بہت چھٹنا یا لیکن ایک برہمن کی بددعا والے نہیں ہو سکتی تھی۔ البتہ پر جاپتی آدھے چاند دیوتا کو اس کی سزا سے آزاد کر سکتا ہے بشرط یہ ہے کہ چاند دیوتا زمین پر ایک جگہ مہادیو کی نشانی کھڑی کرے۔

ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں یہ شرط جس طرح بیان کی گئی ہے وہ اتنی فحش اور اتنی ننگی ہے کہ ہم اسے اشاروں میں بھی بیان نہیں کر سکتے۔ تصور فرمائیے کہ یہ تفصیلات ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں لکھی ہیں اور اپنے مذہب کو ہندو مقدس کہتے ہیں یہ ہے اصلیت ہندوؤں کے سب سے بڑے مندر کی جس کی تفصیل پڑھ کر آپ محسوس کریں گے کہ ہندو اسے کتنا مقدس سمجھتے تھے۔

روایت کے مطابق چاند دیوتا نے سونمات کے مقام پر مہادیو کی نشانی ایک گول اور اونچی چٹان کی شکل میں کھڑی کر دی۔ اس پر ایک مندر تعمیر کیا گیا جسے سونمات (یا سونمانہ) کا نام دیا گیا۔ سوم کے معنی ہیں چاند اور نات (یا ناتھ) کے معنی ہیں آقا۔ یعنی سونمات کا مطلب ہے "چاند کا آقا"۔

معمولی پڑھے لکھے لوگ بھی جانتے ہیں کہ سمندر میں چاند کے مطابق مد و جزیر پیدا ہوتا ہے۔ اس دوران سمندر ساحل کی طرف ہٹتا ہے اور موجیں ساحل سے ٹکراتی ہیں۔ سونمات کا مندر چونکہ سمندر کے کنارے پر تھا اس لیے موجیں مندر کی دیوار سے ٹکراتی تھیں اور پانی اوپر کو اچھل کر دیوار کو جیسے دھوتا رہتا تھا۔ پندتوں نے اپنے

کے علاوہ وہ کسی جوان سال مسلمان کو بھی ساتھ لے جائے اور اُسے سونپ دے
کے دروازے پر نوک کرے۔

ہمارا راجن نے مسلمان لڑکی اور مسلمان آدمی کی تلاش شروع کر دی۔ ایک
ہمارا راج کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا، لیکن اب وہ ہمارا راج نہیں، خانہ بدوش
تھا۔ گوالیار اور اردگرد کے علاقوں میں مسلمان بہت ہی کم تھے۔ زیادہ تر مسلمان بیٹھے
نشان اور لاہور کے علاقوں میں تھے۔ شرط یہ بھی تھی کہ لڑکی خوبصورت ہو اور آدمی
بھی خوب رو اور جوان ہو۔

ایک روز اُس کی ملاقات ایک پنڈت سے ہو گئی جو گوالیار کے مندر میں ہوتا
تھا۔ اب وہاں مندر تو تھا لیکن وہ مسلمانوں کے قبضے میں تھا اور وہاں کوئی بُت
نہیں تھا، کوئی مورتی نہیں تھی۔ وہاں اب نہ سکھ بچے تھے نہ گھنٹیوں کی آوازیں آتی
تھیں۔ وہاں کے دیوتا خاموش تھے اور اس خاموشی سے وہاں بائج وقت سا دن
کی مقدس صدا ابھرتی اور باطل پر رازہ طاری کرتی تھی۔ ہمارا راجن نے پنڈت سے
پوچھا کہ وہ اب کہاں ہوتا ہے۔

”جنگل میں“۔ پنڈت نے جواب دیا۔ ”مندر اُجڑ جانے سے دیوتا کہیں بھاگ
تو نہیں جاتے۔ مندر نہ رہے تو پوچھا پاؤ گے تو کوئی نہیں روک سکتا۔ ہم نے جنگل میں
جا کر ایک گھنٹہ مندر بنا لیا ہے۔ آپ دیکھ لیں ان مسلمانوں پر کسی تباہی آئے گی۔
یہ پلید لوگ جنگی طاقت کے گھمنڈ میں ہری کرشن اور مادو اور شنو دیو کو شکست دینے
آئے ہیں۔ یہ لوگ زندہ جل کر راکھ ہوں گے۔“

”ابھی تو ہم راکھ ہو رہے ہیں پنڈت جی ہمارا راج!“۔ ہمارا راجن نے کہا۔
”کیا آپ ابھی تک نہیں سمجھے کہ ہری کرشن، مادو، اور شنو دیو ہم سے ناراض ہیں؟“
”یہ پاپ آپ کا ہے جن کے پاس فوج تھی۔“ پنڈت نے کہا۔

”مجھے گنہ اور تلوچن پال نے دھوکہ دیا۔“ ہمارا راجن نے کہا۔ ”ورنہ
غزنی کا ایک بھی سپاہی زندہ واپس نہ جاتا اور محمود ہزار قیدی ہوتا۔ میں نے تم کھائی
تھی کہ غزنی کے اس سلطان کو زندہ پکڑ لوں گا اور ہر روز اس سے مندر میں جھاڑو

موجود رہتی تھیں۔ ہر لڑکی جوانی دھل جانے تک مندر کے لیے وقف رہتی تھی۔
ان کے لیے تین سو سائندے ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ راجے ہمارا راجے اور کیر کیر
لوگ جو سب سے بڑا اور پنڈتوں کے لیے قابل قبول تھے لاتے تھے وہ نو جوان رتھ
ہوتی تھی۔ رفا خاندہ ہو تو نو جوان اور حسین لڑکی کو بھی بہترین تھہ سچھا جانا تھا۔ یہ
تمام لڑکیاں پنڈتوں کی تحویل میں اور ان کے رحم کرم پر ہوتی تھیں اور ان کی عین
کا ذریعہ بنتی تھیں۔ چونکہ یہ بُت جلیبت کی علامت بلکہ آہ تھا اس لیے یہ مندر جائزہ کار کا
اُدھ تھا، طو ریں اپنا آپ پنڈتوں کو پیش کر کے خواہش ظاہر کرتیں کہ پنڈت سب کے سامنے
ان کے ساتھ ملے اختلاف کریں۔ پنڈت ان کی یہ خواہش پوری کرتے تھے۔

ہندوستان کے مختلف علاقوں سے جو ہندو یہاں آتے تھے، ان کے لیے
سرادر داڑھی کا منڈوانا ضروری ہوتا تھا۔ اس کام کے لیے مندر میں تین سو عوام سو جو
رہتے تھے۔

سلطان محمود کو ابھی سومات کے متعلق تفصیل سے کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔
اُس نے سومات تک پہنچنے کی سوچ بھی نہیں تھی۔ غزنی سے سومات کا فضائی
فاصلہ نو سو میل ہے۔ وہاں سے سومات تک کے سفر میں جو دریا آتے ہیں جو
پہاڑی علاقے آتے ہیں اور بیکانیر کا جو صحرا آتا ہے، ان سب کو تصور میں لائے
اور یہ بھی ذہن میں رکھئے کہ اُس وقت تو ہمیں ٹھوکروں پر ادھیل کو چ کیا کرنی تھی۔

✱

جن دنوں سلطان محمود اردگرد کے سرداروں اور حکمرانوں سے اطاعت
قبول کرانے میں مصروف تھا، ان دنوں گوالیار کا ہمارا راجن پنڈتوں اور شیو
کے دروازوں پر گر رہا تھا۔ اُس نے سلطان محمود سے بہت بُری شکست
کھائی تھی۔ خود اپنی قوم اُس سے نفرت کرنے لگی تھی۔ ایک برٹشی نے اُسے کہا
کہ وہ کچھ تھنے لے کر سومات جاتے اور وہاں کے پنڈتوں کے پاؤں میں گر کر
اپنی کا پالٹنے کی پرا تھنا کرے۔ پنڈتوں نے اُسے کہا کہ جو تھ وہاں کے پنڈتوں
کو پسند ہے وہ ہے ایک یا دو نو جوان لڑکیاں جو بہت خوبصورت ہوں۔ اس

دلیا کروں گا اور وہ مندر میں پوجا کے لیے آنے والوں کی جوتیاں سیدھی کیا کرے گا... لیکن اب ان باتوں سے کیا حاصل! مجھے بتایا گیا ہے کہ ایک خوبصورت مسلمان لڑکی اور ایک جوان مسلمان کو ساتھ لے کر سومات جاؤ۔ لڑکی مندر کو پیش کر دو اور مسلمان کو مندر کے دروازے پر ذبح کر دو اور دو چاند شو دیو کے قدموں میں مانٹا ڈھونڈ بھولنا راج واپس کر دیں گے۔

”آپ نے میرے دل کی بات کر دی ہے۔“ پنڈت نے کہا۔ ”لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہیں۔ آپ یہ کام کر سکتے ہیں۔“
 ”گورنمنٹ ہوں۔“ مہاراجہ ارجن نے کہا۔ ”لیکن مسلمان لڑکی اور آدمی کہاں سے لائیں؟“
 ”کیا آپ کنگال ہو گئے ہیں؟“ پنڈت نے کہا۔ ”آپ کے پاس کچھ تو ہو گا۔ شرکامل جائے گا۔“

”بہت کچھ ہے۔“ مہاراجہ ارجن نے کہا۔ ”میرا صرف راج نہیں رہا۔ آپ بتائیں شرکال کہاں ہے اور وہ میرے قبضے میں کس طرح آ سکتا ہے۔“
 ”کیا آپ کی راجکاریاں دریا پر نہانے نہیں جایا کرتی تھیں؟“ پنڈت نے کہا۔ ”آپ کبھی کبھی غزنی کی شہزادیاں دریا پر جایا کرتی ہیں۔“

”غزنی کی شہزادیاں؟“ مہاراجہ ارجن نے پوچھا۔ ”سلطان محمود تو غزنی میں ہے۔“
 ”میں غزنی کے ان نو جوانوں کی بیویوں اور بیٹیوں کی بات کر رہا ہوں جو قلعے میں ہیں۔“ پنڈت نے کہا۔ ”کبھی بھی تین چار بڑی خوبصورت لڑکیاں تین چار محافظوں کے ساتھ دریا پر آجائیں گی۔ آپ انہیں لکالیں جو میں اپنے آدمیوں کو دے کر دریا لڑکیاں اور ایک باوجود محافظوں کے لائوں گا۔ دریا پندرہ کوس دوسرے جتنی دیر میں گولیار کے قلعے تک خبر پہنچتی ہے ہم بہت دیر نکل جائیں گے۔“

”کیا آپ سومات کے راستے سے رات ہیں؟“
 ”مہاراجہ! آپ کہاں حکومت کرتے رہے ہیں؟“ پنڈت نے کہا۔ ”ہر روزیاں قریب سے وہ سوار گزرتے ہیں جو سومات کے غسل کے لیے گنگا تاناکاپانی لے جاتے ہیں۔ وہ بہت تیز پھرتے ہیں۔ آپ گھوڑوں کا انتظام تو کر سکتے ہیں نا۔“

”کم از کم کچھ گھوڑے درکار ہوں گے۔“
 ”گھوڑے جتنے چاہوں جائیں گے۔“ مہاراجہ ارجن نے کہا۔ ”مجھے برکت اطلاع دے دینا۔“

غزنی کے وہ سالار نائب سالار اور کمانڈر وغیرہ جو ہندوستان کے فتح کیے ہوئے قلعوں میں رہتے تھے، ان کی بیوی بچے بھی غزنی سے آگئے تھے۔ گولیار کے قلعے میں بھی فوجی سرداروں کے کہنے آگئے تھے۔ گولیار سے دریا پندرہ کوس در تھا۔ کچھ لڑکیاں چند ایک محافظوں کے ساتھ لے کر دریا کی سیر اور کشتی رانی کے لیے کبھی کبھی جایا کرتی تھیں۔ ایک روز چار جوان عورتیں دریا پر گئیں۔ ان میں ایک نوجوان لڑکی تھی جو ایک پرانے کمانڈر کی بیٹی تھی۔ اس کا نام شکنتہ تھا۔ اس کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ ان کے ساتھ چار محافظ تھے۔ ان کے اور عورتوں کے گھوڑوں کی تعداد آٹھ تھی۔

ایک جگہ دریا کے کنارے ٹپک گھٹا، ہرنے سرکڈے اور جھاڑیاں بھی تھیں عورتیں اس گھٹی ہریالی کی اوٹ میں ہو گئیں۔ وہ نہانا چاہتی تھیں۔ چاروں محافظ گھوڑوں سے اتر کر کچھ دور جا کر بیٹھ گئے۔ ایک آدمی جو دینا تانگتا تھا، گھبراہٹ کے عالم میں محافظوں کے پاس دوڑتا آیا اور خوف سے کانپتی ہوئی آواز میں کہنے لگا کہ تین آدمی اس کی بیوی کو اس سے چھین کر لے گئے ہیں۔ انہوں نے مجھے مار پیٹ کر بھاگا دیا ہے۔ وہ قریب ہی ہیں اور میری بیوی کو سنگسار کر کے لے کر زبردستی شراب پلا رہے ہیں۔

”آپ مسلمان ہیں مہاراج۔“ اس آدمی نے کانپتے ہوئے کہا۔ ”ہماری عزت کے رکھوالے آپ ہیں۔“

چاروں محافظ اٹھ دوڑے۔ وہ زرا دور چلے گئے تو پانچ چھ آدمی جن کے چہرے صافوں میں چھپے ہوئے تھے مسلمان عورتوں پر لوٹ پڑے۔ انہوں نے کمانڈر کی بیٹی کو اٹھالیا۔ عورتوں نے چیخ و پکار کی تو محافظ واپس دوڑے۔ جب وہ گھنے سرکڈوں اور جھاڑیوں میں آئے تو گھات میں چھپے ہوئے ہندوؤں نے نہیں

ناصران لوگوں کی زبان سمجھتا تھا شگفتہ نہیں سمجھتی تھی۔ اُس نے فارسی زبان میں ناصر سے پوچھا کہ یہ لوگ کیا کہہ رہے۔ ناصر نے اُسے بتا دیا شگفتہ خوفزدہ ہونے کی بجائے فارسی میں بڑے غصے میں بولنے لگی۔ بڑے پنڈت نے ناصر سے پوچھا کہ یہ لڑکی کیا کہہ رہی ہے۔

”یہ کہہ رہی ہے کہ میں تمہارے شیو دیو پر اللہ کی لعنت بھیجتی ہوں۔“ ناصر نے خواب دیکھ کر یہ کہہ رہی ہے کہ ہم نے تمہارے بہت سے دیوائے پاؤں تلے مسل ڈالے ہیں اور یہ کہہ رہی ہے کہ تمہارے بہت سے دیوتاؤں کے بتوں کو ہم نے غنی میں لے جا کر توڑا تھا اور ان کے ٹکڑے گھوڑ دوڑ کے میدان میں بکھر دیئے تھے۔ یہ تمہارے مندر میں نہیں رہنا چاہی۔“

”اے کوہ کوہ سارے مذہب کی توہین نہ کرے۔“ بڑے پنڈت نے کہا۔
 ”وہ شیو دیو اپنی توہین کا انتقام غنی کو تباہ کر کے لیں گے۔“

”تمہارے پتھر کے دیوتا تمہارے خدا کا مقابلہ کریں گے؟“ ناصر نے کہا۔
 ”ہم دونوں تمہارے قیدی ہیں۔ ہم بے بس ہیں۔ ہمارا خدا بے بس نہیں۔ وہ پتھر کا بت نہیں۔ اُس کے انتقام سے بچو پنڈت!“

شگفتہ بے تاب ہو کر ناصر سے پوچھتی تھی کہ کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ ناصر نے اُسے بتایا تو وہ اس قدر غصے سے بولنے لگی کہ اُس کے منہ سے تھوک اڑا کر پنڈت کے منہ پر پڑنے لگا۔ وہ اُن پر لعنت بھیج رہی تھی۔

”ارجن مہاراج!“ پنڈت نے مہاراج ارجن سے کہا۔ ”یہ دونوں ڈرنے کی بجائے ہم پر برس رہے ہیں۔ کیا انہیں یہ اسید ہے کہ ہم ان سے ڈر کر انہیں چھوڑ دیں گے؟“

”ہم صرف خدا سے ڈرتے ہیں پنڈت!“ ناصر نے کہا۔ ”موت سے ہم ڈرنے والے ہوتے تو غنی میں ہی بیٹھے رہتے۔ ہم اپنے اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام سنانے اور اس پیغام پر اپنی جان قربان کرنے کے لیے آئے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ہم یہاں بے بس ہیں۔ کچھ نہیں کر سکتے۔ لیکن ہم خمرش

کے پہلوؤں میں برجیاں اتار دیں اور ایک کو دلوتج لیا۔

ذرا ہی دیر بعد اُس گھوڑے سر پٹ دوڑتے جنگل میں دوڑ نکل گئے۔ ایک گھوڑے پر مہاراج ارجن شگفتہ کو آگے بٹھاتے سوار تھا۔ ایک پر ایک خواں سال محافظ ناصر اللہ بندھا ہوا تھا۔ ایک گھوڑے پر پنڈت سوار تھا اور باقی پانچ پر پنڈت اور مہاراج ارجن کے وہ آدمی سوار تھے جنہوں نے شگفتہ اور ناصر اللہ کو اغوا کیا اور تین عجافوں کو قتل کیا تھا۔ ان پانچ آدمیوں کو لقمہ انعام پیش کیا گیا تھا لیکن انہوں نے یہ کہہ کر انعام قبول نہیں کیا تھا کہ وہ بھی سومات کی پوجا کے لیے مہاراج ارجن کے خراج پر جائیں گے۔

گویا رطلے میں باقی تین غوریس پندرہ بیس میل پیدل چل کر پہنچیں۔ اُس وقت تک مہاراج ارجن بہت دور نکل گیا تھا۔ رطلے میں کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ مہاراج ارجن اتنی سنگین واردات کر گیا ہے۔ اُس نے دو روز پہلے رطلے کے سالار قندوار کو بتایا تھا کہ وہ سومات کی پوجا کے لیے جا رہا ہے۔ سالار نے اُسے اجازت دے دی تھی۔ اس کے متعلق سب کو یہی معلوم تھا کہ دو روز ہوئے وہ سومات کے سفر پر روانہ ہو چکا ہے۔

شام تک پنڈت کی رہنمائی میں وہ اُس راستے پر پہنچ گئے جس راستے سومات کو لگا کا پانی جایا کرتا تھا۔ انہیں پانی لے جانے والے سوار مل گئے۔ دوسرے دن شگفتہ اور ناصر کو کھول کر مہاراج ارجن نے بتایا کہ ان کا ترنا بیگار ہے اور وہ خاموشی اور اطمینان۔ ان کے ساتھ نہیں۔ ان دونوں کے پوچھنے پر بھی انہیں نہ بتایا گیا کہ انہیں کہاں لے جایا جا رہا ہے۔

بیس روز بعد وہ سومات پہنچ گئے۔ مہاراج ارجن اور پنڈت نے ناصر اللہ شگفتہ کو مندر کے بڑے پنڈت کے سامنے کھڑا کر کے اس کے پاؤں چھوئے اور اُسے بتایا کہ وہ اس لڑکی کو مندر کے لیے اور اس آدمی کو شیو دیو کی قربانی کے لیے لائے ہیں۔

ہیں کہ ہم اللہ کی راہ میں قربان ہو رہے ہیں۔ میری جان کی قربانی سے آپ کو کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ میری قربانی اللہ کے حضور جائیگی۔“

انہیں بتا دو کہ اس مندر میں بھی دی ناپیٹنگی جو ہندوستان کے بہت سے مندروں میں آئی ہے۔ ”شگفتہ“ نے ناصر سے کہا۔ ”انہیں خبردار کرو کہ میرے پاک جسم کی توہین کا انتقام میرا خدا ضرور لے گا۔“

ناصر نے پنڈت کو بتا کر شگفتہ نے کہا کہ اسے تو پنڈت نے عجیب سی سنجیدگی سے لے کر کہا۔ ”تم اسے لہجے ہو جو تمہیں نظر نہیں آتا۔ تم اندھے ہو مانند بھیرے میں جی ہے ہو۔ تم نہیں جانتے یہ مندر کس کا ہے جسے تم پتھر کو رہے ہو، یہ شہود بوسے یہاں تمہارے جسم سے جان نکالی بھی جاسکتی ہے اور مردہ جسم میں جان ڈالی بھی جاسکتی ہے۔“

”مجھے یقین ہے کہ تم پتھر کے دیوتا کا یہ کمال مجھے نہیں دکھاسکتے۔“ ناصر نے کہا۔ ”اور یہ میرا عقیدہ ہے کہ اس لڑکی نے اس مندر کی تباہی کی جو شہین گئی کی ہے وہ بڑی ہو کے رہے گی۔“

”بہاراج! گویا ار کے پنڈت نے سومات کے پنڈت سے کہا ”کیا ان کے ساتھ اتنی باتیں کرنا ضروری ہے؟“ آپ ان کا مذہب بدل سکتے ہیں نہ یہ ہمارا مذہب بدل سکتے ہیں۔“

”اے!۔“ پنڈت نے کہا۔ ”ان کے ساتھ اتنی باتیں بیکار ہیں۔ انہیں یہ بتا دینا ضروری تھا جو ان کو اس آدمی کو سننے چاند کی پہلی رات قربان کیا جائے گا اور اس کا خون شہود بوسے کے قدموں میں اڑا دیا جائے گا۔ اسے بتانا اس لیے ضروری ہے کہ ہم کسی کو دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتے۔ اسے معلوم ہونا چاہیے کہ سومات نے اسے قربانی کے لیے پسند کیا ہے۔ یہ خوش قسمت انسان ہے۔“

”آپ اپنے دیوتاؤں کو دھوکہ نہیں دینا چاہتے۔“ ناصر نے کہا۔ ”کیا تمہارے شہود کو کو معلوم نہیں کہ ہم دونوں کو دھوکے میں اٹھایا گیا ہے اور ہمارے تین ساتھیوں کو قتل کیا گیا ہے؟ کیا تمہارا مذہب اتنے بڑے جرم کی اجازت دیتا

ہے؟“ بڑے پنڈت نے اپنے بالوں کو بلایا اور انہیں کہا کہ ان دونوں کو لے جاؤ۔

”شگفتہ! ناصر نے بڑی تیزی سے بولتے ہوئے کہا۔ ”غزنی کی بیٹیوں کی طرح اپنی آبرو پر قربان ہو جانا۔ میں نکلنے کی کوشش کروں گا۔“

دونوں کو مندر کے ایک ایسے حصے میں لے گئے جو ایک فراخ صحن تھا۔ شگفتہ کو الگ کر لیا گیا اور ناصر کو دوسری طرف لے جانے لگے۔ ان کے ہاتھ پائے بند ہوئے نہیں تھے۔ دونوں کے ساتھ دو آدمی تھے۔ اچانک ناصر کو شگفتہ نے ماری بلند آواز سے دی۔ ”ناصر خدا حافظ۔“ اس کے ساتھ ہی شور اٹھا۔ ”پر دلو۔“

ناصر نے اُدھر دیکھا۔ وہاں ایک کنوئیں تھا۔ اُسے شگفتہ کنوئیں کے چوڑے کنارے پر کھڑی نظر آئی اور وہ کنوئیں میں کود گئی۔ ناصر کے ساتھ جو دو آدمی تھے، وہ بھی کنوئیں کی طرف دوڑے۔ ان کے شور پر بہت سے آدمی آگئے۔ شام گہری ہو چکی تھی۔ صحن میں صرف ایک مشعل جل رہی تھی۔ سب آدمی شگفتہ کو کنوئیں سے نکالنے کے لیے بھاگ دوڑ رہے تھے۔ رے کنوئیں میں پھینکا گیا اور ایک آدمی ٹپتے سے اتر گیا۔ کچھ دیر بعد کنوئیں میں سے اُس کی آواز سنائی دی۔ ”مگر کی ہے۔“

اس ہڑونگ میں کسی کو ناصر کا خیال نہ رہا۔ اس کے ساتھ جو دو آدمی تھے، وہ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ انہیں ناصر نظر نہ آیا۔

ناصر مندر سے دور نکل گیا تھا۔ یہ خلی مدد تھی کہ اُسے ایک درخت سا نظر آ گیا تھا۔ اس میں سے وہ نکلا تو آگے کھلا میدان تھا اور تاریکی۔ اُسے ایک طرف مندر نظر آیا۔ وہ دوسری سمت چل پڑا۔ اس علاقے میں وہ اجنبی تھا۔ چلتے چلتے آگے دریا آ گیا۔ یہ دریا نے سرسوتی تھا جو سومات سے تین میل کے فاصلے پر تھا۔ وہ دریا پار کر گیا۔ اُسے کسی مسکن گھرانے میں ایسی پناہ مل گئی تھی لیکن اسے

معلوم نہیں تھا کہ اس علاقے میں مسلمان ہیں بھی یا نہیں۔ وہ چلتا گیا۔ وہ رات بھر چلنا چاہتا تھا۔

دو چار میل اور گیا ہو گا کہ اُسے روشنی دکھائی دی۔ یہ کوئی گاؤں تھا۔ وہ اُدھر چل پڑا۔ جب گاؤں کے قریب پہنچا تو اُسے ایک مکان نظر آیا جس پر عینار سے تھے۔ اُسے شک ہوا جیسے یہ مسجد ہو لیکن اُسے یقین نہیں تھا کہ اس علاقے میں مسجد ہو سکتی ہے۔ پھر بھی وہ دروازے کی طرف چلا گیا۔ دروازہ کھلا تھا۔ آگے چھوٹا صحن اور آگے برآمدہ سہا تھا۔ وہاں دیا جل رہا تھا جس کے پاس ایک سفید ریش آدمی بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ ناصر اندر جانے سے ڈر رہا تھا۔ وہ دروازے کے ساتھ لگا کھڑا رہا۔

”السلام علیکم“ اُسے اپنے قریب آواز سنائی دی۔

”وعلیکم السلام“ اُس نے جواب دیا۔

سلام کرنے والے نے ایسی زبان میں بات کی جو ناصر نہ سمجھ سکا لیکن اسلام کے رشتے نے سب خوف اور شک دور کر دیئے تھے۔

”مسلمان“ ناصر نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا ”غزنی“۔ یہ عا کے سلطان تھا۔ اُس نے کچھ اشارے کئے تو وہ آدمی اُسے اندر لے گیا۔ وہ مسجد تھی اور پیش امام کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ یہ لوگ اس علاقے کے رہنے والے تھے۔ ان کی زبان ہندوستانی سے مختلف تھی۔ ناصر نے اشاروں سے انہیں یہ سمجھا دیا کہ وہ سومات سے بھاگا ہے اور اُسے پناہ کی ضرورت ہے۔ پیش امام نے ایک اور آدمی کو بلوایا۔ وہ ہندوستان کی وہ زبان جانتا تھا جو ناصر سمجھ اور لوں سکتا تھا۔ ان کی وساطت سے پیش امام کو پتہ چلا کہ ناصر کون ہے، اس پر کیا گزری ہے اور اب اسے یہاں سے نکالنا ہے۔

یہاں کے لوگوں کو سلطان محمود غزنوی سے کوئی واقفیت نہیں تھی۔ انہوں نے جب انہیں نے اڑی اڑی سنی ہے کہ شمال مغرب سے ایک بڑا ہی ظالم اور ظالم شاہ آتا ہے جو کسی نہ کسی مندر کے بُت توڑ کر وہاں سے زبرد جواہرات اپنے ساتھ

لے جاتا ہے۔ یہ بات انہوں نے اُن ہندوؤں سے سنی تھی جو ہندوستان سے سومات کی پوجا کے لیے آتے رہتے تھے۔ ناصر لکھنؤ نے انہیں بتایا کہ وہ کوئی لیڈر بادشاہ نہیں بلکہ مسلمان سلطان ہے جو ہندوستان میں محمد بن قاسم کے دور کو زندہ کر رہا ہے اور وہ یہاں اسلام کو فروغ دینے کے لیے بُت توڑنا اور مندروں کو اجاڑنا ہے۔

”ہم عربی نسل کے لوگ ہیں۔ پیش امام نے اُسے بتایا۔ ہمارا شجرہ نسب اُن مجاہدین سے ملتا ہے جو محمد بن قاسم کے ساتھ آئے تھے۔ ہمارے آباؤ اجداد نے وکیل سے دور نیچے اُدم تک کے ساحلی علاقے میں اسلام پھیلا دیا تھا۔ اس سومات کی اُس وقت کوئی اہمیت نہیں تھی۔ یہ محمد بن قاسم کے دور کے بعد اتنا مقبول ہوا ہے۔ برہمنوں نے اس کے ساتھ ایسی ایسی رواجیتیں والیہ کر رکھی ہیں کہ راجہ ہمارا ہے بھی یہاں آتے ہیں۔ اگر سلطان محمود واقعی بُت شکن ہے اور اسلام کا علمبردار ہے تو اُسے شاید معلوم نہیں کہ سومات کا مندر کبھی ہے جسے ہندو اتنا ہی مقدس سمجھتے ہیں جتنا ہمارے لیے خانہ کعبہ ہے۔“

”اگر آپ لوگ مجھے ایک گھوڑا دے دیں تو میں گوالیار واپس جانے کی بجائے سیدھا غزنی جاؤں گا۔“ ناصر نے کہا۔ ”اس سلطان سومات پر حملے کی ترغیب دوں گا۔“

”تم شاید اپنا انتقام لینا چاہتے ہو۔“ پیش امام نے کہا۔ ”اور تم اس مسلمان

لڑکی کے خون کا بدلہ لینا چاہتے ہو جو اپنی عصمت پر کنوئیں میں کوڑو کر قربان ہو گئی ہے۔ ہم نہیں بتاتے ہیں کہ یہاں کیا ہوتا ہے۔ ہم نہیں گھوڑا دے کر یہاں سے نکال دیں گے اور ہم نہیں غزنی تک کا چھوٹا راستہ بھی سمجھا دیں گے۔ اپنے سلطان کو بتانا کہ سومات وہ مندر ہے جو اسلام کو لٹکا رہا ہے اور اسلام کا مندر چڑھا رہا ہے۔ اس مندر میں یہ معلوم کتنی مسلمان لڑکیاں لائی جا چکی ہیں جنہیں بتوں کے آگے ہندوؤں کی موجودگی میں مادر زاد غریباں کر کے بچایا جاتا ہے اور کبھی کبھی یہاں ایک مسلمان کو ذبح کیا جاتا ہے۔ ہمارے گھروں میں کوئی بچی خوب صورت نکلتی

ہاتھ رکھے۔ رات کو قطعی ستارے کو اپنی ناک اور دائیں کندھے کے درمیان رکھے۔ علاقہ پہاڑی ہو تو اسے گھومنا مڑنا پڑے گا۔ وہ کئی ٹرے دن کو سورج اور رات کو قطعی ستارے کو اُسی زاویے پر رکھے جو اُسے بنایا گیا ہے۔

اگلی رات کے اندھیرے میں ناصر الدولہ ایک بڑی اچھی نسل کے تومنہ لونٹ پر سوار ایسے سفر پر روانہ ہو گیا جس میں دیا بھی تھے، بڑے ظالم صواہر بھی، پہاڑ اور جنگل بھی تھے۔ اُسے بہت جلد ہی غزنی پہنچنا تھا۔



یہاں ایک اور روایت کا بیان بھی ضروری ہے۔ رادی ایک شاعر شیخ دین ہے جس نے اپنی ایک کتاب میں سومات پر سلطان محمود غزنوی کے حملے کا منظم ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب ۶۱۸ھ میں لکھی گئی تھی اور اس کا ترجمہ ایک انگریز میجر جے۔ ڈبلیو۔ والٹن نے کیا تھا۔ یہ روایت مختصر ایوں ہے کہ سومات کے علاقے میں سلمان خامی قتلہ میں آباد تھے۔ وہاں کا ہمارا جہ کنوز رائے انہیں اپنا غلام سمجھتا تھا۔ ہر روز ایک مسلمان کو سومات کے مندر کی دیوار پر بزدل کیا جاتا تھا۔ وہاں کے مسلمان اپنے خدا سے آہ و زاری کرتے رہتے تھے۔ مکہ مندر میں ایک بزرگ حاجی محمد تھے۔ ایک رات انہیں خواب میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی حضور نے حاجی محمد سے فرمایا کہ ہندوستان کے علاقہ سومات میں جاؤ اور مسلمانوں کی نجات کا بندوبست کرو۔ حاجی محمد اپنی روحانی قوت سے سومات آئے اور اس قوت سے ہمارا جہ کنوز رائے کی توجہ اپنی طرف کر لی۔ ایک روز حاجی محمد نے ایک بوڑھی عورت کو دیکھا جو آہ و زاری کر رہی تھی۔ اس سے آہ و زاری کا سبب پوچھا تو معلوم ہوا کہ اگلے روز ڈنڈیا کے جوان اور اکھڑنے بیٹے کو مندر میں ذبح کیا جا رہا ہے۔ حاجی محمد نے ہمارا جہ کنوز رائے تک اپنا پیغام پہنچایا کہ اس جوان آدمی کی جگہ اپنے آپ کو قربانی کے لیے پیش کرتے ہیں۔

ہمارا جہ نے اسے اپنی توہین سمجھا۔ کسی طرح ہمارا جہ کو بہ چل گیا تھا کہ حاجی محمد

ہے تو ہم اُسے کہیں دُور بھیج دیتے ہیں یا وہ پورا کھنہ کہیں دُور چلا جاتا ہے۔ جس طرح ننیں یہاں لایا گیا ہے، اس طرح اکثر یہاں ہندوستان سے بڑے خوب صورت نوجوان مسلمانوں کو لاکر ذبح کیا جاتا ہے۔ یہ مندر ایک عیسائی عقیدے پر کھڑا ہے اور یہاں کے پنڈت دن رات موس کاری میں بدست رہتے ہیں۔ پیش امام نے ناصر الدولہ کو پوری تفصیل سے سومات کی تاریخ سنائی اور اُسے بتایا کہ اس کے ساتھ کون سی روایتیں وابستہ ہیں۔

”اپنے سلطان سے کہنا کہ ہندوستان کے ساحل سے اسلام آگ کے قریب رکھے ہوئے موم کی طرح گھٹنا اور غائب ہوتا جا رہا ہے۔“ پیش امام نے کہا۔ ”یہاں کے مسلمان خوف و ہراس کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور آہستہ آہستہ یہاں سے ہندوستان کے اندرونی علاقوں کو ہجرت کر رہے ہیں یا واپس عرب جا رہے ہیں اور یہاں ہندوؤں کے باطل عقیدے پھیلے جا رہے ہیں۔“

”سلطان آئے گا۔“ ناصر الدولہ نے کہا۔ ”تم آئیں گے اور انشاء اللہ آپ دیکھیں گے کہ ہندوؤں کے اس سب سے زیادہ طاقتور دیوتا کے ٹکڑے کس طرح اڑتے اور خاک ہوتے ہیں۔ آپ مجھے گھوڑا اور کچھ زاد راہ دے دیں اور راستہ سمجھا دیں۔“

مندر کے ارد گرد ناصر کو تلاش کیا جا رہا تھا لیکن مندر کے پنڈتوں کو اس کا کوئی علم نہیں تھا۔ علم صرف ہمارا جہ ارچن اور اُس کے ساتھ آئے ہوئے پنڈت کو تھا۔ اُن کی دونوں قربانیاں ہاتھ سے نکل گئی تھیں۔

اُس وقت ناصر جینیل دُور ایک مسجد میں بیٹھا تھا پیش امام نے اُسے پیٹ بھر کے کھانا کھلایا تھا اور گاؤں کے ایک بہت سی بوڑھے آدمی کو بلالیا تھا جو بدر دراز علاقوں کے راستوں اور سمٹوں سے واقف تھا۔

”گھوڑا نہیں اسے اونٹ دے دو۔“ بوڑھے نے کہا۔ راستے میں بڑا ہی وسیع صحرا ہے۔ گھوڑا بغیر پانی کے مر جائے گا اور ناصر بھی زندہ نہیں رہے گا۔“ بوڑھے نے ناصر کو سمجھایا کہ وہ دو پہر تک سورج کو دائیں ہاتھ اور دو پہر کے بعد بائیں

اونٹ ناصر کو پیٹھ پر اٹھائے چلا جا رہا تھا۔ ناصر اسے دوڑا رہا تھا۔ اونٹ بٹکھ
اور جلد آباد کا رنگت ان پار کر گیا۔ ناصر اس کی پیٹھ پر ہی اُونٹ لیتا تھا اور اونٹ کو بہت
مختور آرام دیتا تھا۔

سلطان محمود اپنے پڑوسیوں اور دشمنوں کو ایک معاہدے کا پابند کر کے اور ہر ایک
سے فوج کی کچھ نفری لے کر غزنی پہنچ گیا تھا۔ دو چار روز بعد اسے اطلاع دی گئی کہ
ہندوستان سے غزنی کی فوج کا ایک محافظ (بادی کارڈ) ناصر الدولہ آیا ہے۔ سلطان نے
اُسے فوراً پیش کرنے کو کہا۔

ناصر کو اندر لے جایا گیا۔ دو آدمیوں نے اُسے سہارا دے رکھا تھا۔ وہ اپنے پاؤں
پر کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ اُس کا سر ڈول رہا تھا چہرہ لاش کی طرح ہونکا تھا۔ سلطان
کے حکم سے اُسے سلطان کے پلنگ پر لٹا دیا گیا اور طبیب کو بلا یا گیا۔ طبیب نے اُس کے
منہ میں کوئی دوائی ڈالی اور اُس نے کہا کہ اس پر فشی بھی طازی ہے اور عینہ بھی۔
اسے جگایا جائے۔ طبیب اپنے اٹھ سے اُس کے منہ میں شہد ڈال رہا۔

کئی گھنٹوں بعد ناصر ہوش میں آیا اور بیدار ہوا۔ اُسے کچھ کھلایا پلا یا گیا تو وہ
بولنے کے قابل ہوا۔ اُس نے سلطان کو بتایا کہ اُسے اور شگتہ کو کھن طرح اغوا کر
کے سومات تک لے جایا گیا اور وہ کس طرح دلوں سے فرار ہوا اور اونٹ پر
یہاں پہنچا ہے۔ اُس نے سومات کے متعلق سلطان کو تفصیلات سنائیں اور کہا
کہ دلوں کے مسلمان اُس مجاہد کی راہ دیکھ رہے ہیں جو انہیں ہندوؤں کی دہشت
سے نجات دلانے گا۔ ناصر نے سلطان کو ہنسی کی مسجد کے پیش امام کا بیہوشام دیا۔

”یہ ہے وہ ہم جس کے اشارے سے مجھے میری
روح دے رہی تھی“۔ سلطان محمود نے
کہا اور اُس نے ہندوستان کا نقشہ اپنے سامنے
رکھ لیا۔ دیبل کے مقام پر انگلی رکھ کر اُس نے

کہے باس کوئی ایسی طاقت ہے کہ انہیں سامنے آکر جان سے نہیں مارا جاسکے گا۔
مہاراجہ نے سوچا کہ انہیں بے گناہیں مارا جائے۔ مہاراجہ نے انہیں بیخام بھیجا کہ انہیں
ذبح نہیں کیا جائے گا بلکہ مہاراجہ انہیں اپنے ساتھ سموز مہمان کی طرح مندر میں لے
جا کر مندر کی شان و شوکت دکھائے گا چنانچہ مہاراجہ حاجی محمد کو مندر میں لے گیا۔
اُس کے ساتھ اپنے محافظ تھے جنہیں اُس نے سمجھا دیا تھا کہ انہیں کیا کرنا ہے۔
مندر میں گھومتے پھرتے مہاراجہ کنوڑائے نے اپنے محافظوں کو اشارہ کیا
کہ وہ پیچھے سے تلوار کے وار کر کے حاجی محمد کو قتل کر دیں، لیکن محافظ جہاں کھڑے
تھے، دلوں سے ہی نہ سنے، جیسے زمین نے انہیں جکڑ لیا ہو۔ مہاراجہ اتنا خوفزدہ
ہوا کہ حاجی محمد سے معافی مانگی اور انہیں عزت سے رخصت کیا۔

حاجی محمد غزنی چلے گئے اور سلطان محمود سے کہا کہ انہوں نے رسول اللہ کے
حکم سے اسے منتخب کیا ہے کہ سومات کا بت توڑے اور اس مندر کو تباہ و برباد
کرے جو ہزاروں مسلمانوں کا خون پی چکا ہے۔ سلطان محمود فوج لے کر فوراً چل پڑا۔
اُس نے سومات کے مہاراجہ کنوڑائے کو شکست دی۔ مہاراجہ نے صلح اور دوستی
کی درخواست کی۔ سلطان محمود نے اُسے اسلام قبول کر لے کو کہا مگر مہاراجہ نے انکار
کر دیا اور آخر دم تک لانے کے لیے قلعہ بند ہو گیا۔

اس دوران حاجی محمد فوت ہو گئے۔ وہ سلطان محمود کے ساتھ سومات آئے
تھے۔ سلطان محمود نے قلعے کا محاصرہ کیا مگر قلعہ سر نہ ہو سکا۔ محاصرہ بارہ سال جاری
رہا۔ قلعہ سر نہ ہو سکا۔ وزیر نے سلطان محمود سے کہا کہ حاجی محمد اُس سے ناراض ہو
کے فوت ہوئے ہیں، کچھ نہ وہ اُن کی بیمار پر ہی کے لیے نہیں گیا تھا۔ سلطان محمود اُسی
وقت حاجی محمد کی قبر پر گیا اور کوتاہی کی معافی مانگی۔ سلطان کو ایک اشارہ ملا اُس
نے اس پر عمل کیا اور دونوں میں قلعہ فتح ہو گیا۔

یہ روایت قارئین کی دلچسپی کے لیے سنائی گئی ہے۔ یہ بالکل بیہوشیا اور دہشت
ہے۔ صحیح صرف یہ ہے کہ ۱۰۲۵ء تک سلطان محمود کو سومات کے متعلق کوئی زیادہ
علم نہیں تھا۔

کہا۔ ”محمد بن قاسم نے پہلا سرکرہ یہاں لڑا تھا۔۔۔ اور یہ ہے سومات۔“ اُس نے اُسی وقت اپنے سالار ابو عبد اللہ محمد الطائی کو بلا لیا۔

”ابو عبد اللہ!“ سلطان محمود نے کہا۔ ”مجھے ایسے محسوس ہو رہا ہے جیسے یہ میری آخری جنگی بہم ہوگی۔ فتنہ دیکھو۔ بڑا ہی بے سفر ہے اور بڑا ہی دشمن لیکن ہمیں اس سفر پر روانہ ہونا ہے۔ اگر میں وہاں تک زندہ پہنچ گیا تو میں تاریخ میں ایسے باب کا اضافہ ذکر جاؤں گا جو میری تمام فتوحات پر غالب آئے گا اور آنے والی نسلیں میرے نام کے ساتھ سومات کا نام ضرور لیا کریں گی۔“

ابو عبد اللہ فتنے کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ پہاڑوں میں بھی لڑا تھا، جنگوں، میدانوں اور صحراؤں میں بھی لڑا تھا۔ اُس نے دریائی سفر کے بھی (نے) تھے لیکن فتنے پر سومات پر نظر میں جا کر وہ گہری سوچ میں کھو گیا کہ وہ اپنی فوج وہاں تک پہنچا سکیں گے؟

”جانتے ہو محمد بن قاسم کہاں سے آیا تھا؟“ سلطان محمود نے کہا۔ ”میں اس کی تاریخ اور روایت کو دہرا کرنا چاہتا ہوں۔“

”لاہور چلا اپنا ہے۔“ ابو عبد اللہ نے کہا۔ ”وہاں سے ہم رسد وغیرہ لے سکتے ہیں۔ اس سے آگے تمناں ہمارا اپنا ہے۔ وہاں سے اونٹ لینے پڑیں گے۔ آگے بڑا وسیع صحرا ہے۔“

”سب کچھ ہے میرے رفیق!“ سلطان محمود نے کہا۔ ”آؤ۔ بیٹھو۔ ایمان اور الاداء مضبوط ہو تو کٹھن سفر بھی سہل ہو جایا کرتے ہیں۔“ دونوں فتنے پر جھک گئے اور بہت دیر منصوبہ بناتے رہے۔

سلطان محمود کو شاید احساس نہیں تھا کہ وہ ایسی ہم سر کرنے جا رہا ہے جو سر ہوگی تو یہ اسلام کی ہندومت پر سب سے بڑی فتح ہوگی اور خود ہندوؤں کو اپنے عقیدوں پر شک ہونے لگے گا۔

غزنی سے سلطان محمود کے کوچ کی تاریخ اور سال کے متعلق مؤرخوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اُس وقت کی تحریروں سے شہادت ملتی ہے کہ سلطان محمود نے ۱۸ اکتوبر ۱۰۲۵ء (۲۲ شعبان ۴۱۶ھ) غزنی سے کوچ کیا تھا۔ کسی بھی مؤرخ نے نہیں لکھا کہ اُس کی فوج کی تعداد کیا تھی۔ ہر ایک نے قیس ہزار گھوڑ سوار لکھے ہیں۔ بعض نے قیس ہزار رضا کار لکھے ہیں جنہوں نے سلطان سے کہا تھا کہ وہ باقاعدہ فوج کی طرح خواہ نہیں لیں گے۔ یہ صحیح ہے کہ قیس ہزار رضا کار تھے اور وہ ترک تھے۔

سلطان محمود جب ہندوستان کی سرحد میں داخل ہوا تو اُس نے لاہور کو قیس سے نکال دیا۔ اُس نے مٹان کا رخ کر لیا۔ اتنی بڑی فوج دیکھ کر یہاں کے لوگوں میں تجسس کی لہر دوڑ گئی کہ سلطان اتنی زیادہ فوج لے کر کیوں آیا ہے۔

فوج ۱۵ رمضان المبارک (۹ نومبر ۱۰۲۵ء) کے روز مٹان پہنچی۔ سلطان محمود نے سومات کے متعلق پھر اللہ کی اطلاع پر فوراً کوچ کا حکم اس وجہ سے بھی دے دیا تھا کہ سردیوں کے موسم کا آغاز تھا اور یہی موسم برق رفتار پیش قدمی کے لیے موزوں تھا، درہ مٹان اور بہاول پور سے آگے جو ریگزار تھا وہ اُس کی فوج کا دم خم توڑ دیتا اور فوج جنگ کے لیے بے کار ہو جاتی۔

سلطان محمود کی مٹان میں آمد تیز و تند طوفان کی آمد تھی۔ اُس نے مٹان میں مقیم اپنے حکام کو اکٹھا کر کے کہا کہ فوراً اسے سومات تک کے راستے کی دشواریوں اور دشمن کی رکاوٹوں کے متعلق مکمل معلومات دی جائیں اور یہ خاص انتظام کیا جائے کہ دشمن کے جاسوسوں کو یہ نہ پتہ چلے کہ غزنی کی فوج کا کیا ارادہ ہے۔

اتنی بڑی فوج کی اچانک آمد اور اُس کے کوچ کو پوشیدہ رکھنا ممکن نہ تھا۔ مٹان میں جاسوس موجود تھے۔ وہاں ہندو بھی آباد تھے بلکہ ہندوؤں کی آبادی زیادہ تھی۔ مٹان میں غزنی کی جو فوج اور انتظامیہ موجود تھی، اس میں ایمان فروش بھی موجود تھے۔ ہندوؤں نے اپنی خوب مسرت شیعوں اور زروچاہرات کا جادو چلا رکھا تھا۔ انہیں ایک ہی ملک میں معلوم ہو گیا کہ سلطان محمود سومات جا رہا ہے۔ ہندوؤں

کا شو دیو سومات میں تھا۔ شو دیو ان کے دیوی دیوتاؤں کا دیوتا تھا۔ سومات کی بھابی تو دور کی بات ہے، اس کی صرف توہین کو ہی ہندو اپنی تباہی سمجھتے تھے۔ انہیں جب پتہ چلا کہ سلطان سومات جا رہا ہے تو وہ کانپ اٹھے۔ انہوں نے اپنی نوجوان بیٹیوں کی عصمت اور تقدس کی پھیلیوں کے عوض یہ راز حاصل کیا اور اسی وقت درپردہ قاصد دوڑا دیئے۔

ان کے قاصد ان چھوٹے چھوٹے راجوں اور ان بڑے ہمارا جوں تک پہنچے جن کے ساتھ ابھی سلطان محمود کی فکرمندی نہیں ہوئی تھی۔ ہندوؤں نے سومات کو بھی قاصد بھیج دینے کو نمازاجہ کنور رائے کو خبردار کر دیں اور وہ غزنی کی فوج کو سومات سے دور ہی روک لے۔

ادھر سلطان محمود اونٹوں اور پانی کا انتظام کر رہا تھا۔ اس دوران اسے ملتان کے ایک صوفی بزرگ نے جنہوں نے اسے کہا کہ اسے سلطان سومات کو ان قلعوں جیسا قلعہ سمجھنا جو تم نے اب تک سر کیے ہیں، اور سومات کو ان مندروں جیسا مندر نہ سمجھنا جو تم نے اب تک تباہ کیے ہیں۔ سومات پر حملہ ایسے ہی ہے جیسے ہندو خانہ کعبہ پر حملہ کر دیں۔ کیا ساری دنیا کے مسلمان نہیں ہرٹس گئے، سومات میں تمہارا مقابلہ بڑی سخت ہوگا، اور ذہن میں رکھو کہ یہ ایک قلعے یا ایک مندر کی نہیں، یہ اسلام اور ہندو مذہب کی جنگ ہوگی۔ یہ دو عقیدوں کا تصادم ہوگا۔ یہ صحیح معنوں میں حق اور باطل کا مقابلہ ہوگا۔ اگر تم مار گئے تو سمجھ لو کہ اسلام مار گیا۔ ہندو کا عقیدہ جڑ پکڑ جائے گا کہ ان کا شو دیو سچا ہے اور اس کی طاقت کے آگے کوئی کٹھن نہیں سکتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ساحلی علاقوں کے مسلمان ہندو ہو جائیں گے یا انہیں ہندو بنالیا جائے گا۔

”معلوم ہوتا ہے میں بہت بڑا خطرہ مول لے رہا ہوں“ سلطان محمود نے کہا۔ ”زندگی کا اور اپنی جگوں کی تاریخ کا سب سے بڑا خطرہ بزرگ نے کہا۔ جنگی امور کو تم اچھ طرح سمجھتے ہو۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں صرف یہ بتا سکتا ہوں کہ دشمن تم سے بے خبر نہیں۔ اپنی چار پائی کے نیچے لاکھی پھیر رہے ہیں آستین میں بھانگو ہمارے

چراغ کے نیچے اندھیر ہے۔“

”کیا آپ مجھے کوئی ٹھوس بات بتا سکتے ہیں؟“ سلطان محمود نے پوچھا۔ ”میرے شاگردوں نے بتا دیے ہیں کہ ایک حاکم کے متعلق بتایا ہے کہ وہ اپنا ایمان ہندوؤں کے ہاتھوں فروخت کر چکا ہے۔“ بزرگ نے کہا۔ ”یہ حاکم شروع سے ملتان میں ہے۔ آج رات یا کسی رات جب رات آدھی گزر جائے تو اس کے گھر پر نظر رکھنا۔ اس کے گھر کوئی آنے کا یا وہ کسی کے گھر جا۔“

*

اسی رات سلطان محمود کو اس نائب سالار نے جسے سلطان نے اس حاکم کے گھر پر نظر رکھنے پر مامور کیا تھا اطلاع دی کہ وہ حاکم ایک لبا چٹھہ پن کر اور سر پر کپڑا ڈال کر گھر سے نکلا اور ایک ہندو کی حویلی میں چلا گیا ہے۔ سلطان محمود نے حکم دیا کہ اس مکان کو محاصرے میں لے کر کسی طرح ادھر پہنچا جائے اور اُدھر سے کوڈ کر اندر جایا جائے تاکہ اس حاکم کو جرم کی حالت میں پکڑا جائے۔

حکم کی تعمیل بلا تاخیر ہوئی۔ حویلی کے دروازے پر اس لیے دھک نہ دی گئی کہ اندر کے لوگ ادھر ادھر ہو جائیں گے۔ حویلی کے آگے اور پیچھے آدمی کھڑے کر دیئے گئے۔ ساتھ دالے مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ جو نہ دروازہ کھٹکھٹائی کے فوجی اندر پہلے گئے اور گھر کے کنبوں سے پوچھ کر کہ ساتھ والی حویلی میں کس طرح اترا جاسکتا ہے، اُدھر پہلے گئے۔ نیچے اترنے کا راستہ بندھنا بندھنے سے رستہ لٹکا کر ایک آدمی نیچے اُترا۔

اسے کسی نے لٹکارا۔ اسے شاید ڈاکو سمجھا گیا تھا۔ اُدھر سے آواز آئی۔ ”تم جہاں ہو وہیں کھڑے رہو ورنہ تیرا تباہی۔ ہم ڈاکو نہیں ہیں۔“

دس بارہ آدمی رستے سے نیچے اتر گئے اور لٹکارے والے آدمی سے پوچھا کہ غزنی کا حاکم کون سے کمرے میں ہے۔ دو کمرے کے دروازے بیک وقت کھٹکھٹائے گئے۔ دو تین آدمی باہر آئے اور وہ پھر اندر چلے گئے۔ غزنی کے فوجی دوڑتے

کا اہتمام تھا۔ جو نقشہ ہندوؤں کی حویلی سے برآمد ہوا تھا، اس میں وہ مقام اور علاقے بنے ہوئے تھے جہاں غزنی کی فوج پر شنب خون مارنے کے لئے اور جہاں سے سلطان کو غلط راستے پر ڈالنا تھا۔

سلطان محمود نے ان سے سب کچھ اگوا لیا تو اپنا فیصلہ سنایا۔ ان ہندوؤں سے ان کے تمام ساتھیوں کی نشاندہی کراؤ اور ان سب کو گرفتار کرو۔ میرے پاس لے گئے۔ غرض شاہ نہیں۔ ان سب کو کوٹھڑیوں میں بند کر دیا۔ آنگہ یہ سب مڑ جائیں۔ سب کی لاشیں باہر پھینک دینا۔ ان کے جو مسلمان ساتھی ہیں، وہ کال کو کوٹھڑیوں میں مڑ جائیں تو ان کی لاشیں بھی ان کے ساتھ پھینک دینا۔ دفن نہ کرنا۔ یہ روز قیامت ان کافروں کے ساتھ اٹھائے جائیں گے۔ مجرم حاکم کے متعلق اس نے حکم دیا۔ جب فوج سومات کو کوچ کرے، اس غدار کے پاؤں باندھ کر ایک گھوڑے سے دھچھے باندھ دیا جائے۔ جہاں یہ مڑ جائے اس کی لاش وہیں پھینک دی جائے۔ فرخی سلطان محمود کا درباری شاعر تھا۔ اُس نے سلطان کے سومات پر حملے کی پیش قدمی راستے کی دشواریوں اور سومات کی فتح کی منظوم داستان لکھی تھی۔ اس کی صورت ایک قصبے کی ہے۔ اس میں ایمان فروشوں کی غداری کا ذکر ہے۔ اس کا مختصر سا ذکر تاریخ فرخ الدین مبارک شاہ میں بھی ملتا ہے اور اس میں یہ بھی تحریر ہے کہ جب غدار نے بے نقاب ہو گئی تو اُس رات تراویح کے بعد سلطان محمود "نادیر نکرانے کے نوافل پڑھتا رہا۔ صبح اُس نے اپنے رفیقوں سے کہا کہ میرے اللہ کو مجھ سے کوئی بڑا ہی عظیم فرض ادا کرانا۔۔۔ اسی لیے اس ذات باری نے مجھے نابینا میں روشنی دکھائی ہے، اور نہ المیرے میں یہ سانپ مجھے دس لیتے۔

جو پانی آگے کے علاقے دیکھے گئی تھی، اُس نے بتایا کہ سب سے بڑی ٹھکانی صحرانیکو ہے گا۔ پانی کا دُور دُور تک نشان نہیں۔ سلطان محمود نے پانی کا یہ انتظام کرایا تھا کہ تیس ہزار اونٹ جمع کر لیے جن پر پانی کے ٹینک لادے گئے تھے۔ گھوڑوں کو بھی پانی بلانا تھا۔ بعض موٹھیں نے لکھا ہے کہ ہر گھوڑا سوا کو پانی سے لے

دس کے لیے ہم فخر سے اپنا جسم استعمال کرتی ہیں۔
"اس دھرتی پر اسلام نہیں رہے گا۔" مسیری لڑکی نے کہا۔ "میں جہاں مذہبی پیشواؤں نے سبق دیا ہے کہ اپنے حسن اور جسم کو بٹھا کر ہر گھوڑا اور اس سے اپنے دھرم کے دشمن کو مار دو۔۔۔ ہم آپ سے صرف یہ عرض کرتی ہیں کہ ہمیں فوراً ہلاک کر دیا جائے۔ اذیت دے کر نہ مارا جائے۔"

"میں تمہیں غراج تحسین پیش کرتا ہوں۔" سلطان نے جو زجہاں کی وساطت سے لڑکیوں سے باتیں کر رہا تھا کہا۔ جس دھرم کی بنیاد عورت اور دیہ کاری پر رکھی گئی ہو اُس کی عورتیں ہندسی طرح فخر سے بدی کا ارتکاب کیا کرتی ہیں۔ میں تمہاری خواہش پوری کروں گا۔ تمہیں فوراً ہلاک کر دیا جائے گا۔۔۔ لے جاؤ نہیں۔"

*

مجرم حاکم اور اس کے ہندو ساتھیوں نے بتا دیا کہ وہ کیا کر رہے تھے۔ اس حاکم کو ہندوؤں نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ اب اُسی نے انہیں بتایا تھا کہ سلطان محمود سومات کو تباہ کرنے کے لیے جا رہا ہے اور اُس کے حکم سے آگے کے علاقے دیکھنے کے لیے آدمی چلے گئے ہیں۔ اس فوج نے پہلا کام یہ کیا کہ راجوں ہمارا جوں کو اطلاع دینے کے لیے قاصد دوڑا دیے اور سومات والوں کو بھی خبردار کرنے کے لیے آدمی بھیج دیے تھے۔ مسلمان حاکم نے ان قاصدوں سے یہ کہا تھا کہ وہ راجوں دیر سے کہیں کہ جب غزنی کی فوج ہندول پور سے آگے بیکانیر کے صحرائیں سے گزر رہی ہو تو اس پر شنب خون ماریں اور زیادہ تر تیر استعمال کریں۔ پانی اونٹوں پر ساتھ جا رہا تھا۔ اونٹوں پر لدے ہوئے ٹینک پر تیزوں سے چھلنی کرتے رہیں۔

ان کی حکیم یہ تھی کہ تمام راستے غزنی کی فوج کو پریشان رکھا جائے اور اسے پانی سے محروم کیا جائے۔ زیادہ سے زیادہ اونٹ مارے جائیں اور دودھ لگے جا کر وہاں سے مقامی آدمیوں کے بھیس میں کچھ آدمی سلطان کو ملیں اور کہیں کہ وہ اس کی فوج کو قریبی اور آسان راستے سے کاٹھا دارانک پہنچا دیں گے۔ یہ سلطان کو گمراہ کرنے

ہوئے دو ادنٹ دیئے گئے تھے۔ دو موہنیں نے اونٹوں کی تعداد میں ہزار رکھی ہے لیکن اکثریت نے تعداد میں ہزار بتائی ہے جو صحیح معلوم ہوتی ہے۔ اونٹوں کے علاوہ ہر زیادہ سپاہی اور سوار کو حکم تھا کہ وہ جتنا پانی پھونکے ٹیکڑوں میں اٹھا سکتا ہے ساتھ رکھے۔

سلطان محمود نے خدا کا شکر اس لیے ادا کیا تھا کہ اسے پہلے ہی پتہ چل گیا تھا کہ راجوں مہاراجوں نے اُسے راستے میں پریشان کرنے کا انتظام کر رکھا ہے۔ دشمن کے شیخوں سے دوسرے نقصان کے علاوہ ایک نقصان یہ بھی متوقع تھا کہ فوج کی رفتار بہت سست ہو جائے گی۔ اگر اُسے یہ اطلاع نہ ملتی تو اُس نے فوج کو قافلے کی صورت میں لے جانے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ اب اُس نے فوج کی ترتیب بدل دی۔ سب سے پہلے اُس نے راستے کا تعین کیا۔

اُس نے ہراول کو یوں تقسیم کیا کہ دیکھ بھال کی پارٹیاں الگ کر دیں جنہیں بکھر کر بہت آگے آگے جانا تھا۔ فائیں اور بائیں کئی لڑاکا حش الگ کیے جنہیں فوج اور دیکھ بھال پارٹی کے درمیان جانا تھا لیکن دائیں اور بائیں دوڑ دوڑ کر تاکہ دشمن کی چھاپہ مار پارٹیوں کو فوج سے دُور ہی اُلجھایا جائے۔ پڑاؤ کی صورت میں اور رات کو فوج کے دوران ان عیشوں کو باری باری ساری رات جاگنا اور چونکا رہنا تھا۔ رسد اور پانی والے اونٹوں کی حفاظت کا یہ انتظام کیا گیا کہ سوار دستوں کو ان کے دائیں اور بائیں رہنا تھا۔

غزنی کی فوج کی ایک خوبی تو یہ تھی کہ اس کا کمانڈر سلطان محمود تھا جس نے جنگی چالوں میں تاریخ میں نام پیدا کیا ہے۔ دوسری خوبی یہ کہ اس کے چھاپہ مار حش صحیح معنوں میں جاننا اور ذہین تھے۔ سلطان محمود ان کی تقسیم اور ان کا استعمال دانشمندی سے کرتا تھا۔ تیسری خوبی یہ کہ ہر سپاہی اپنے سلطان کے لیے نہیں بلکہ اپنے مذہبی عقیدے اور نظریے کے لیے لڑتا تھا۔ یہ سلطان محمود کی تربیت کا اثر تھا۔ سب سے بڑی خوبی تیز رفتاری تھی۔ جنگ کے دوران دستوں تک احکام اور ہدایات پہنچانے کا انتظام بہت تیز تھا اور جو بھی کسی بڑے یا چھوٹے کمانڈر کو کوئی

حکم پہنچا تھا۔ اس پر نہایت تیزی سے عمل ہوتا تھا۔ جنگ کے دوران دستوں کی نقل و حرکت اتنی تیز ہوتی تھی کہ دشمن کو کھلا جاتا تھا۔

۱۲ شوال ۴۱۶ھ (۲۶ نومبر ۱۰۲۵ء) عید الفطر کے روز زلد سلطان محمود نے قتان سے کوئٹہ کا حکم دیا۔ عید الفطر کے روز اُس نے خطبے سے پہلے تمام فوج سے خطاب کیا:

”آپ سب کو عید مبارک ہو۔ یہ خیال ذہن سے نکال دیں کہ ہم وطن سے دُور عید منا رہے ہیں۔ جس زمین پر شہیدوں کا خون بہہ جاتا ہے، وہ مجاہدین اسلام کا وطن بن جاتا ہے جہاں مرد مجاہد کی انان گوشتی ہے وہ اُس کا وطن ہے ہندوستان تہا رہے۔۔۔۔۔ یہ عید ہم میں سے کئی ایک کی آخری عید ہوگی۔ ہم ایک ایسی قوم پر جا رہے ہیں جو ہماری زندگی کا سب سے زیادہ کڑا امتحان ہے۔ ہندو کہتے ہیں کہ مسلمان تباہ ہونے کے لیے سو منات جا رہے ہیں۔ آپ کو اب جو بُت توڑنا ہے اُسے ہندو طاقت کا دیوتا کہتے ہیں۔ آپ کو یہ ثابت کرنا ہے کہ طاقت اللہ کے پاس ہے۔ پتھر کا بُت ٹوٹنے میں سخت ہو سکتا ہے، طاقتور نہیں ہو سکتا۔ آپ کو ہندوؤں کے اس عقیدے کو توڑنا ہے۔“

سلطان نے اپنی فوج کو بتایا کہ محمد بن قاسم کتنی دُور سے کتنی مشکلات اور دشواریوں میں سے گذر کر ہندوستان میں آیا تھا۔ سلطان نے کہا کہ سو منات کے مندر میں آپ جیسے مسلمان جوان آدمیوں کو ذبح کیا جاتا ہے اور تہا ساری بیٹیوں اور بیٹیوں جیسی مسلمان لڑکیوں کو ہندو دیوتا کے مندر کے بندتوں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ انہیں عیاں کر کے چھایا جاتا ہے اور تم سمجھ سکتے ہو کہ ان کے ساتھ اور کیا سلوک ہوتا ہو گا۔ کیا تہا ساری عزت یہ گوارا کر سکتی ہے؟

سلطان نے فوج کو ناصر اور شگفتہ کا واقعہ سنایا اور کہا۔ ”اس کنوارے مسلمان بیٹی کی لاش کنوئیں سے نکال کر کہیں باہر پھینک دی گئی ہوگی۔ اُس نے اپنی عزت پر جان قربان کی ہے۔ اُس کی روح تجھے راتوں کو بے چین رکھتی ہے۔ ہمیں قوم کی اس بیٹی کا انتقام لینا ہے۔“

سلطان محمود کا یہ خطاب اس قدیم جذباتی اور اشتعال انگیز تھا کہ فوج بے چین ہو گئی اور لہروں سے سپاہیوں کے سینے پھٹنے لگے۔ یہی سلطان کا مقصد تھا۔ اس نے فوج کو راستے کی دشواریوں اور خطروں سے آگاہ کیا اور انہیں جذباتی اور ذہنی طور پر ہر خطرے کے لیے تیار کر لیا۔

✱

سواروں نے لکھا ہے کہ فوج کو ایسی ترتیب سے کوٹھ کر لیا گیا کہ سب سے آگے والے آدمی اور سب سے پیچھے والے آدمی کے درمیان ایک سو میل کا فاصلہ تھا۔ فوج ایسے صحرائیں داخل ہو گئی جس کے متعلق سلطان نے معلومات لے لی تھیں مگر صحرائیں اور آگے جا کر اسے احساس ہوا کہ اُسے کچھ بھی بتایا گیا تھا۔ یہاں ایک غلط فہمی دور کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ متعدد تاریکوں میں لکھا ہے کہ سلطان محمود لٹان سے اجیر گیا جہاں بہاراجہ اجیر سے اُس کی لڑائی ہوئی اور سلطان نے بہاراجہ کو شکست دی۔ یہ غلط ہے۔ اجیر اس راستے سے بہت ہی دور ہے جس سے سلطان گیا تھا۔ دوسرے یہ کہ اُس وقت اجیر کا وجود ہی نہیں تھا۔ اجیر کا سنگ بنیاد ۱۱۰۰ء میں یعنی سومات کی تباہی کے ۵۰ برس بعد رکھا گیا تھا۔ ایک انگریز تاریخ دان سر ڈیو ہیگ نے لکھا ہے کہ یہ اجیر نہیں بلکہ نام کا ایک مقام تھا جو چوہان خاندان کا دار الحکومت تھا۔ اُس دور کا نقشہ دیکھیں تو آپ کو اجیر کہیں بھی نظر نہیں آئے گا۔

فوج جب بیکانیر کے صحرائیں داخل ہوئی تو رستہ اور بانی کے اونٹوں کے دائیں اور بائیں جو سوار دستے تھے، اُن پر رات کو حملہ ہوا جس کی صورت بخون کی تھی لیکن ہندوؤں کو معلوم نہیں تھا کہ اونٹوں کی حفاظت کا انتظام موجود ہے۔ سواروں کے درمیان وسیع شگاف تھا۔ چھاپہ مار اس میں سے گزرنے لیکن اونٹوں تک پہنچنے سے پہلے ہی سواروں کے گھیرے میں آگئے اور مارے گئے۔ دوسرا حملہ دن کے وقت ایسے علاقے میں ہوا جس میں صحرائی ٹیلے اور چائیں تھیں۔ ہندو تیر انداز ٹیلوں میں چھپے ہوئے تھے۔ اُن کے تیروں کی پہلی بوچھاڑ نے

کچھ نقصان کیا۔ چار پانچ اونٹوں کے جسموں میں تیر لگے۔ وہ بے مہار ہو کر بھاگ اٹھے۔ ہندو چھاپہ ماروں کو یہ خوش فہمی تھی کہ اُن کے عقب میں کچھ بھی نہیں لیکن عقب سے رسالے کا آدھا رستہ آگیا اور چھاپہ مار کچھ مارے گئے اور کچھ پکڑے گئے۔ جو پکڑے گئے ان سے معلوم کر لیا گیا کہ اُن کے باقی چھاپہ مار کہاں کہاں ہیں۔ اس کے مطابق سلطان نے پیش بندی کر لی۔

اگر صرف صحرا کا حساب کیا جائے جو سلطان محمود کی فوج کو عبور کرنا پڑا تو یہ کم پیش پانچ سو میل تھا۔ آگے دیرا بھی تھے۔ صحرائیں گھاس کی سی بھی نظر نہیں آتی تھیں۔ گھوڑوں کو خشک دابہ اور خشک گھاس کھلائی جاتی تھی جس سے انہیں بیاس زیاہ ملتی تھی۔ اونٹ تو صحرائی جانور تھے، آسانی سے چلتے تھے، گھوڑے جلدی خشک جاتے تھے۔ سب سے زیادہ مصیبت پیادہ فوج کے لیے تھی۔ سپاہیوں کے پاؤں ریت میں دبھلتے تھے۔

سب سے پہلی بڑی لڑائی لڈراہ (موجودہ لدوروا) کے مقام پر ہوئی جہاں دشمن لڑائی کے لیے تیار تھا کیونکہ اُسے قبل از وقت اطلاع مل چکی تھی۔ یہ بارہ دروازوں کا خاصا بڑا شہر تھا۔ سلطان نے شہر کو محاصرے میں لے کر ایسے بے ہوش کر دشمن گھیر لیا اور شہر کے دروازے کھل گئے۔ سلطان نے شہر سے پانی اور رستہ کا ذخیرہ پورا کیا اور آگے چل پڑا۔

صحرائیں اُسے دشمن سے کٹی اور جگہوں پر چھپیں لڑائی پڑیں۔ اُس کی ترتیب اور فوج کا پھیلاؤ ایسا تھا کہ معمولی نقصان اٹھا کر دشمن کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا گیا۔ دسمبر کے آخر میں یعنی ایک مہینہ صحرائیں گزار کر سلطان پٹن کے مقام پر پہنچا وہاں ہندوؤں کی کم و بیش میں ہزار فوج نے سلطان کا راستہ روک لیا۔ ہندوؤں کو سلطان کے ارادوں کا علم تھا اس لیے وہ سومات کو بچانے کے لیے بے جگری سے لڑے مگر شکست کھا گئے۔ سلطان کو خلاصا نقصان اٹھانا پڑا۔ اس سے پہلے اودھ پر پور کے مقام پر بھی لڑائی ہوئی تھی۔

اب سلطان محمود کی فوج آج کے احمد آباد کے علاقے میں داخل ہو چکی تھی۔

تیار ہے۔ شہر کی دیواروں پر فوج کے علاوہ ہندو شہری بھی تیر کمانیں منبھالے کھڑے تھے۔ یہ شہری غزنی کی فوج کا مذاق اڑا رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ ہندوؤں نے یہ مشہور کر رکھا ہے کہ سلطان محمود ہندوستان میں اتنے مندر تباہ کرنے اور بڑے بڑے طاقتور ہاراجوں کو اس لیے شکست دینے میں کامیاب رہا ہے کہ سومات کا بت شودیوان سے ناراض تھا۔ اب شودیوانوں کو گھنٹ کر اپنے گھر لے آیا ہے اور انہیں تباہ و برباد کر دے گا۔ جب شہر کا محاصرہ کیا گیا تو دیواروں سے ہندو کہتے تھے "مسلمانو! تم یہاں تباہ ہونے کے لیے آئے ہو۔ سومات تم سے اپنی توہین کا انتقام لے گا۔"

مندر کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ دس ہزار پنڈت پوجا میں مسلسل مصروف تھے۔ نوجوان اور خیمیں داسیاں بھجن گارہی تھیں اور نواح بھی رہی تھیں۔ سارے شہر کی عورتیں مندر میں جمع ہو گئی تھیں۔ سومات کا ہاراج کنور رائے لعلی کی دیواروں پر رنگیوں اور بازاروں میں گھوم پھر کر فوج اور شہریوں کو جوش دلانا تھا۔ کسی جگہ کاراج پر دیوانی فوج اور اپنا خزانہ لے کر آ گیا تھا۔

سلطان محمود نے ہندوؤں کا یہ جوش و غروش دیکھا تو وہ گہری سختی میں کھو گیا۔ اُس نے اپنے آپ کو بہت بڑے امتحان میں ڈال دیا تھا۔ وہ شہر کو جلد از جلد فتح کرنے کی سکیم بنانے لگا۔

"ابو عبد اللہ!" اُس نے اپنے سالار سے کہا "کل جمعۃ المبارک ہے میں کل علی الصبح حملہ کرنا چاہتا ہوں۔ فوج تیار رہے۔" اور اُس نے سالار اعلیٰ کو اپنی سکیم تفصیل سے بتائی۔

ابو عبد اللہ محمد الطائی کے چہرے پر ایسا تاثر تھا جیسے حالات اُن کے خلاف ہیں۔ اُس کا خدشہ غلط نہیں تھا۔

سلطان کو اُس کے دیکھ بھال کے دستوں اور جاسوسوں نے بتایا کہ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے سومات کے ہاراج کو ادھر ادھر سے ٹھک مل رہی ہے اور سومات تک پہنچنا آسان نہیں ہو گا۔ غزنی کی فوج کا یہ عالم تھا کہ ٹھک کر چور ہو چکی تھی۔ چور کی صورتوں کے علاوہ لڑائیاں بھی لڑنی پڑی تھیں۔ ہندوؤں کی فوج تازہ دم تھی اور دفاعی جنگ لڑنے کے لیے تیار۔ خود سلطان محمود اور اس کے سالار ابوالعباس محمد الطائی کی جسمانی حالت دیگر گوں ہوئی جا رہی تھی۔ وہ دونوں فوج کا دماغ تھے اس لیے اُن کے سر بھی سوچ سوچ کر دکھ رہے تھے۔ فرنگی نے منظم داستان میں فوج کی حالت ان الفاظ میں بیان کی ہے:

"قوم کے ہمارے ٹھک کر ایک دوسرے کا جھجکا رہا ہے اور ایک دوسرے کا سہارا بنتے تھے۔ اُن کی رفتار کم ہو گئی مگر سر کے میں وہ بہت تیز تھے۔"

سلطان محمود کو جب اطلاع ملی کہ ہندوستان سے سومات کے دفاع کے لیے ٹھک کر رہی ہے تو اُس نے گائیڈوں سے ٹھک کے متوقع راستے معلوم کر کے سوار دستے ان راستوں پر بھیج دیئے تاکہ وہ منزل کی طرف پیش قدمی بھی جاری رکھیں اور ٹھک کو بھی زبردستی۔ اب سومات کا کام قدرے آسان ہو گیا تھا کیونکہ چھ ماہ ختم ہو چکا تھا۔ موسم سرد تھا۔

*

سلطان محمود ۶ جنوری ۱۰۲۶ (۴ ذی القعدہ ۴۱۱ھ) بروز جمعرات سومات کے قریب اُس مقام پر پہنچ گیا جہاں اُسے اپنی فوج اکٹھی کر کے سومات کو محاصرے میں لینا تھا مگر دشمن اسے سومات کے باہر ہی روکنے کے لیے تیار تھا۔ سلطان محمود نے کچھ اپنی آنکھوں سے اور زیادہ تر جاسوسوں کے ذریعے دشمن کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ سومات کا شہر قلعے کے اندر تھا اور یہ بہت بڑا شہر تھا۔ اس کے تین طرف مندر تھا اور سامنے ایک وسیع اور گہری خندق تھی۔

سلطان کو یہ چلا کہ یہاں دو راجوں کی فوج پہنچی ہوئی ہے جو قلعے سے باہر

کی خبریں مل سکتی ہیں اور مل رہی ہیں وہ ہمارا جوں کی توہیں ہمارا ہمارے توڑنے کے لیے آ رہی ہیں۔ وہ ہم پر عجب سے حملہ کریں گی۔ میں آپ کو اپنی فوج کی تقسیم بتا چکا ہوں۔ میں آپ کو دوسرے خطروں اور دشواریوں سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نا تجربہ کار نہیں ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ جو فوج اپنے وطن سے اتنی دور لڑے جاتی ہے، اسے دشمن تیردوں اور غواروں سے مارنے کی بجائے بھوکا اور پیاسا مار سکتا ہے۔ یہاں کی ہوائیں بھی ہماری دشمن ہیں۔ ہمیں کہیں سے بھی رسید نہیں مل سکتی۔ تیر جو کھانوں سے نکل جائیں گے، وہ واپس نہیں آئیں گے۔

”بہنیں کہیں سے بھی کمک نہیں مل سکتی۔ اگر ہمارے طول پیر گیا تو رسد اور فوج کی کمی میں پیدا ہونے پر مجبور کر دے گی۔ میں آپ کو خبردار کرتا ہوں کہ ہم ناکام ہو کر پیا ہونے تو فوج بددل ہو جائے گی۔ دشمن ہمیں پیا نہیں ہونے دے گا۔ ہم میں سے کوئی خوش قسمت ہی پانی کی صورت میں زندہ نکل کر جائے گا۔ اس صحرا کو دہن میں لائیں جس سے گزرتے ہیں اتنا عرصہ لگا ہے کہ ایک چاندرو با اور ایک ابھرا اس وقت فوج تازہ دم تھی۔ لمبے عرصے اور ناکامی کے بعد فوج اس صحرا میں سے گزرنے کے قابل نہیں ہوگی۔ یہاں سے غزنی تک کا فاصلہ آپ کے سامنے ہے۔“

”میں جانتا ہوں آپ سمجھ رہے ہیں کہ مجھے اپنے وطن سے اتنی دور ایسے شہر کو سفر کرنے کے لیے نہیں آنا چاہیے تھا۔ مجھے آپ سے اتفاق ہے لیکن آپ کو میرے ساتھ اتفاق ہوگا کہ عموماً میں کام اور حورارہ گیا ہے۔ آپ میرے مقصد کو سمجھتے ہیں۔ میں سومات کو تباہ کر کے اسے سمندر میں ڈبوئیے کی قسم کھا چکا ہوں۔ ایک نائب سالار نے کہا ”دخل انداز کی معافی چاہتا ہوں۔ کیا میں یہ پوچھنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ ہم کیا سارے ہندوستان کے بت توڑ چکے ہیں کہ سومات یہی رہ گیا تھا؟ اس ایک بت کو توڑ کر اور یہاں کے مندر کو تباہ کر کے کیا سارا ہندوستان مسلمان ہو جائے گا؟ میں کہنا چاہتا ہوں کہ ہمیں اتنی دور آنے کا خطرہ مولی نہیں لینا چاہیے تھا۔“

سالار ابو عبد اللہ محمد الطائی بول پڑا۔ اس نائب سالار سے مخاطب ہو کر اس

یہ ستارہ بھی ٹوٹ گیا

نوشہ پچن سال

پہلے سومات کے قلعے کی دیواریں لرز رہی تھیں۔ اندر ”ہر ہر ملو“ کے

جے کاڑے تھے، باہر اللہ اکبر کے نعرے تھے۔ سالار ہندوستان غریبوں اور چیکاہوں کے تصادم سے مل رہا تھا۔ سلطان محمود غزنوی نے شام کے بعد اپنے سالاروں کو جمع کر رکھا تھا۔ اس نے سب کے چہروں پر نظریں دوڑائیں۔

”آپ جو محسوس کر رہے ہیں وہ آپ کے چہروں پر لکھا ہے۔“ سلطان محمود نے کہا ”میرا احساس آپ سے مختلف نہیں۔ کیا آپ نے یہ بھی محسوس کیا ہے کہ ہم ایسا کیوں محسوس کر رہے ہیں جیسے یہ ہماری زندگی کا شاید آخری معرکہ ہو گا؟... اس لیے کہ اس نے پہلے ہم قلعے فتح کر کے رہے ہیں۔ ہم ہمارا جوں کے خلاف لڑتے رہے ہیں مگر سومات نہ ان قلعوں جیسا قلعہ ہے جو آپ نے آج تک فتح کیے ہیں، نہ یہ ان ہمارا جوں جیسے کسی ہمارے کی جنگ ہے جنہیں آج تک آپ نے شکست دی ہے۔ آج آپ ایک مذہب اور ایک عقیدے کو ٹکڑے کرنے آئے ہیں۔ مذہب باطل ہو تو بھی اسس کے پیروکار اس کی آن پر مڑتے ہیں۔ سومات ہندوؤں کا قبلا و کعبہ ہے۔ آپ نے قلعے کی دیواریں پر ان کا جو دم اور ان کا جوش و خروش دیکھ لیا ہے۔ وہ زندگی اور موت کا معرکہ لڑنے کے لیے تیار ہیں۔“

”یہاں ہمیں کسی جاسوس کی ذرا سیٹی حاصل نہیں۔ مجھے کچھ خبر نہیں کہ قلعے کے اندر کیا ہے اور جب ہم اللہ کو منظور ہوا، قلعے کے اندر چلے گئے تو ہمیں بتلنے والا کوئی نہ ہو گا کہ ہمارا مقابلہ کرنے کتنا ہجوم آئے گا اور کدھر کدھر سے آئے گا۔ ہمیں صرف باہر

نے کہا۔ ”مجھے امید ہے کہ آپ یہ تو نہیں کہنا چاہتے کہ آپ دشمن کے خوف کے تحت بات کر رہے ہیں۔“

”بالکل نہیں۔“ نائب سالار نے جواب دیا۔ ”اگر طارق بن زیاد نے سمندر پار کر کے ایک اجنبی اور دشمن ساحل پر اپنی کشتیاں جلا ڈالی تھیں تو ہم میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہ ہو گا کہ پسالی کا خیال یا خوف دل میں لائے۔“

”مجھے بہت دیر بعد بتہ چلا ہے کہ سومات کے بُت کو ہندوؤں کے تمام بُتوں کا آقا سمجھا جاتا ہے۔“ سلطان محمود نے کہا۔ ”اگر مجھے اُس روز معلوم ہو جاتا جس زور میں نے ہندوستان پر پہلی فوج کشی کی تھی تو میں بسم اللہ سومات کے بُت سے کرتا۔“ سلطان محمود نے تفصیل سے بتایا کہ سومات میں کیا ہے اور ہندوؤں نے یہاں کے بُت کے ساتھ کیسی کیسی ناقابلِ بغض روایتیں اور حکایتیں منسوب کر رکھی ہیں۔ پھر اُس نے کہا۔ ”ہم اُس مقام پر آ گئے ہیں جہاں سے واپسی ناممکن ہے۔ اگر ہم اپنے اس عظیم فرض کو بھول جائیں جو خدا نے ہمیں سونپا ہے تو ہمیں اپنی زندگی کے لیے لڑنا پڑے گا لیکن آپ سب سالار ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ جو سالار اپنی زندگی کے لیے لڑا کرتے ہیں وہ آگے نہیں پیچھے دیکھا کرتے ہیں اور وہ زندہ واپس نہیں جایا کرتے۔۔۔۔“

”میں سومات کو تباہ کر کے اپنے پیچھے یہ روایت چھوڑ جایا جاتا ہوں کہ حق کی آواز پہنچانے کے لیے اور رسولِ موعی کا پیغام پہنچانے کے لیے دنیا کا کوئی خطہ دُور نہیں اور کوئی راستہ اتنا دشوار گزار نہیں کہ اللہ کا سپاہی اس سے گزر نہ سکے۔ ہو سکتا ہے پہلی موت کے بعد کوئی اور محمود ہماری کبھی نہ ہوئی مشعل کو اٹھا کر چلے اور ہندوستان کے بُت خانے مسجدوں اور درس گاہوں میں تبدیل کر دے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو اس ملک میں اسلام اور ہندومت ٹکراتے رہیں گے اور ہندو محمد بن قاسم اور محمود کا انتقام مسلمانوں سے لیتے رہیں گے۔۔۔۔“

”کئی جمعۃ المبارک ہے۔ صبح کی روشنی پھیلنے سے پہلے ماحصرہ مکمل ہو جائیگی لیکن آپ کو بتایا جا چکا ہے کہ یہ ماحصرہ مکمل نہیں ہو گا۔ شہر کے پیچھے نین اطراف سمندر

ہے۔ سلسلے خندق ہے۔ آپ کو قلعے پر یغار کرنی پڑے گی۔ خندق کو ہم عبور کر لیں گے۔ اصل کام تیر اندازوں کو کرنا ہے۔ وہ قلعے کی دیواروں اور برجوں پر تیروں کا مینہ برسا رہے رکھیں گے۔ میٹر ہیاں تیار کی جا چکی ہیں۔ ان سے دیواروں پر چڑھ کر جائے گا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ خود کشی کی کوشش ہوگی لیکن یہ قلعہ بند شہر فتح کرنے کا اور کوئی طریقہ نہیں۔“

یہ ۶ اور ۷ جنوری ۱۰۲۶ء (مجمعات اور مجد) کی درمیانی رات تھی سلطان محمود نے چند لمحے بھی آرام نہیں کیا تھا۔ اس کی ریکم کے مطابق فوجوں کی جو تقسیم ہوئی تھی اس پر عمل ہو رہا تھا۔ دستے نقل و حرکت کر رہے تھے۔ انہیں احکام کے مطابق صبح کی روشنی سے پہلے اپنی اپنی پوزیشن پر پہنچنا تھا۔ سب سے زیادہ مشکل کام ان دستوں کا تھا جنہیں شہر کی دیوار اور دروازوں پر یغار کرنی تھی۔

سلطان محمود نے اپنے سالاروں کو اپنی ریکم ایک بار پھر بتا دی اور کہا۔ ”اب ہندو اپنی بیٹیوں کو ہلدی صفوں میں بیٹھے زہر کے طور پر استعمال نہیں کر سکیں گے۔ اُس نے سالاروں وغیرہ کو دھت کر دیا۔“

یہ تاریخی حقیقت ہے کہ ہندوؤں نے غزنی کی فوج کے سالاروں اور کمانڈروں کو گمراہ کرنے اور معلومات حاصل کرنے کے لیے اپنی حسین اور جوان لڑکیوں سے بہت کام لیا تھا لیکن سومات والوں کو اُس وقت پہلے چلا کر غزنی کی فوج آ رہی ہے جب یہ فوج سومات سے ایک دن سے بھی کم مسافت یعنی دُور رہ گئی تھی۔ ہندو مہاراجے کنور رائے کو بہت ہی زہلی کر دو لڑکیوں والا حربہ استعمال کر سکتا یا غزنی کی فوج میں کوئی اور زہر پھیلا سکتا۔ ہندو جاسوس بھی بے کار ہو گئے تھے۔

✱

جس وقت سلطان محمود اپنے سالاروں کے خون کو گر مار رہا تھا، اُس وقت سومات کے مندر میں جیسے رات آئی ہی نہیں تھی۔ دس ہزار پندت شجود لو کے بُت کے آگے اس کیفیت میں غبارت کر رہے تھے جیسے ماتم ہو رہا ہو۔ وہ زور دے کر گھن گار رہے تھے۔ سینکڑوں حسین اور نیم ہویاں جوان لڑکیاں مسلسل قفس میں ٹھکر رہی تھیں۔

لڑکی کے ہاتھ سے گر پڑا تھا، اٹھایا اور اس سے لڑکی کا دل کاٹ کر سب کو دکھایا۔ پھر اُس نے دل بُت کے دل کے منقار پر بھیر کر دل بُت کے قدموں میں رکھ دیا۔

”میں نے ایک نئی کامیڈیاں شو دیو کے چرنوں میں رکھ دیا ہے۔“ پنڈت نے بلند آواز سے اعلان کیا۔ یہ نہ سمجھیں کہ نئی مرگئی ہے۔ اسے شو دیو دسراجنم دیں گے۔“

پنڈت رفاصہ کی لاش اٹھا کر کسی اور کمرے میں لے گئے۔ ایسی ہی حسین اور جوان ایک اور رفاصہ دوڑتی بُت کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اُس نے بھی اپنے آپ کو تنکا کر دیا۔ خیر ابھی پنڈت کے ہاتھ میں تھا۔ رفاصہ نے خیر اُس کے ہاتھ سے چھپٹ لیا اور اسی طرح اپنا پیٹ چاک کر کے پنڈت سے کہا کہ اُس کا دل شو دیو کے قدموں میں رکھ دیا جائے۔ وہ ابھی زندہ ہی تھی کہ پنڈت نے اُس کا دل نکال کر بُت کے دل کے منقار پر بھیرا اور اُس کے قدموں میں رکھ دیا۔

اس کے بعد باقی دایوں نے جو قص کیا وہ جنات کا قص معلوم ہوتا تھا۔ اس میں موسیقی تو کبھی لیکن ناچنے والیوں کا قص ایسا راسخ اور ہولناک تھا جیسے یہ ان کی زندگی کا آخری ناچ ہو۔ شہنائیاں جیسے کسی کی موت پر چرخ چلا کر بن کر رہی ہوں۔ دف جیسے سینہ کو پی کر رہے ہوں۔ ناچنے والیاں جیسے پاگل ہو گئی ہوں۔ ان کے کپڑے اُترنے جا رہے تھے یا وہ خود انار رہی تھیں حتیٰ کہ وہ مادر زادی ہو گئیں۔ سگڑاں کے رقص کی تال اور سازوں کی سنگت میں دُراسی بھی لغزش نہیں آ رہی تھی۔

دوسرے کمروں میں پنڈتوں کی کھڑیاں اور بھجنوں کے واڈے لے سونات کی رات پر دہشت طاری کر رہی تھی۔ دُراسی دیر میں یہ خبر مندر سے باہر نکل گئی کہ ناچنے والی وادریوں نے اپنے ہاتھوں اپنے دل نکال کر شو دیو کے قدموں میں رکھ

ایک ٹل ٹھکتی تھی تو دوسری ناچنے لگی تھی۔ شہری دڈرتے ہوئے مندر میں داخل ہوئے، بندتوں کے جوم کو چیرے ہوئے بُت تک پہنچتے اور رو دکر بُت کے قدموں میں ہاتھ رگڑتے تھے۔ پنڈت، لڑکیاں اور شہری شو دیو کا قہر بیدار کرنے کے جتن کر رہے تھے مگر ان کے انداز میں خوف و ہراس نہیں تھا۔ دلوں تھا، جوش تھا اور اپنے مذہب پر کھٹنے کا غم تھا۔ مورخ لکھتے ہیں کہ ہندو قہر اور غضب سے پاگل ہوئے جا رہے تھے۔ وہ غزنی کی فوج کو کچی جبا جانے کا عہد کر چکے تھے اور انہوں نے یہ عہد شو دیو کے بُت کے قدموں میں ہاتھ رکھ کر کیا تھا۔ کوئی ہندو منشتہ نہیں تھا۔ وہ بلواروں، جھپیوں، زکریوں اور کمانوں سے لیس تھے۔ وہ اپنے گھر دل کو اور اپنی ہوسٹیوں کو بھول گئے تھے۔ پنڈتوں نے انہیں لعلین دلا رکھا تھا کہ غزنی کی فوج کو شو دیو جو دھنیت کر یہاں تک لائے ہیں اور مسلمانوں کو تباہ ہونا ہے۔ ہندوؤں کے جنوں کا یہ عالم تھا کہ ایک رفاصہ دوڑتی ہوئی بُت کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اُس کے ہاتھ میں خیر تھا۔ اُس نے اعلان کیا۔ میں شو دیو کے قدموں میں دل کا نذرانہ پیش کرتی ہوں۔ وہ پہلے ہی نیم عریاں تھی۔ اُس نے جس ریشمی کپڑے سے ستر ڈھانپ رکھا تھا وہ بھی آکر پھینکا۔ مندر کے اندر سناٹا طاری ہو گیا کسی نے اُس لڑکی کو نہ روکا۔ وہ جوان تھی اور بہت ہی حسین۔ اُس نے فخر کی لوک اپنی آخری پہل کے نیچے رکھی۔ لوک کو دیا، خیر کو بائیں سے دائیں زور سے چٹکا دیا۔ اُس کا پیٹ چاک ہو گیا۔ اُس کا مریں جسم خون سے لال ہو گیا۔ وہ گری نہیں۔

اُس نے اپنا ہاتھ پیٹ کے اندر کیا۔ تب اُس نے چلا کر کہا۔ ”کہاں ہے میرا دل مجھے جہاں دل کہاں ہوتا ہے۔“ وہ اپنے پیٹ کے اتنے بڑے زخم میں ہاتھ ڈال کر دل سُٹول رہی تھی۔

ایک پنڈت دوڑتا ہوا اُس تک پہنچا۔ لڑکی کا سر ڈولا اور وہ گھٹنوں کے بل گری۔ پنڈت نے اُس کے پیچھے بیٹھ کر اس کی بیٹھ اپنے سینے سے لگا لی اور اس کے پیچھے ہوئے پیٹ میں ہاتھ ڈال کر ہاتھ اوپر سینے میں لے گیا۔ اُس نے خیر جو

جس کا دماغ چل گیا ہو، یا وہ خوش فہمیں میں مبتلا ہو یا جنگی قیادت (جنرل شپ) میں غیر معمولی مہارت اور عزت رکھتا ہو۔ آج کے جنگی مہتر بھی جب سومات کا ذکر کرتے ہیں تو وہ اسے روس پر پولین کی فوج کشی سے تشبیہ دیتے ہیں۔ پولین روس میں جا کر تباہ و برباد ہو گیا تھا، خود سلطان محمود بھی بظاہر تباہ و برباد ہونے کے لیے سومات لگتا تھا۔ مورخوں کے مطابق، خود سلطان محمود نے سومات پینچ کر محسوس کر لیا تھا کہ اس کے حساب کتاب میں اُسے غلطی لگی ہے، وہ غلط جگہ آگیا ہے۔ اسی لیے اُس نے اپنے سالاروں سے کہا تھا کہ ہم اس مقام پر آگئے ہیں جہاں سے دہلی نکلن ہے۔ ہم سومات کی فوج کے لیے نہ لڑے تو ہمیں زندہ پسا ہونے کے لیے بڑی خوفناک لڑائی لڑنی پڑے گی، پھر کیوں نہ ہم اُس مقصد کے لیے لڑیں جس کے لیے آئے ہیں۔

محمد قاسم فرشتہ نے البرہنی اور اُس دور کے ود قانع نگاروں کے حوالے سے جن میں ایک امام خا بدین یونس جو فوج کے امام کی حیثیت سے سومات آئے تھے، لکھا ہے کہ مسلمانوں کی فوج ایک جذبہ بے کرا آئی تھی اور یہ جذبہ لوٹ مار نہیں تھا۔ جذبہ کے ساتھ اسے جو قیادت ملی تھی وہ اسے بڑے بڑے دشوار حالات اور خطروں سے بچانے کی اہمیت رکھتی تھی۔ ان قانع نگاروں نے لکھا ہے کہ سومات پر فوج کشی جنگی لحاظ سے اور سیاسی لحاظ سے اور مذہبی لحاظ سے ایک جہازِ اقلیم تھی جو ایک عظیم مقصد کا حامل تھا۔

اسی مورخوں اور قانع نگاروں نے لکھا ہے کہ محمد بن قاسم ہندوستان پر عرب کے قیدیوں کو جنہیں ہمارا راجہ داہر نے اپنے قید خانے میں ڈال دیا تھا، چھڑانے آیا تھا۔ بعد میں اُس نے یہاں اسلامی حکومت قائم کرنے کی سوچی لیکن سلطان محمود غزنوی صرف اسلام کا پیام لے کر آیا اور یہ عزم کہ سومات کا باعث توڑ کر ڈھابا کرے گا کہ ان کے چاند کے آفتاب کی کوئی حیثیت نہیں اور بعض ڈھونگ اور سوائگے ہیں۔ مورخ اس پر بھی سختی ہیں کہ سلطان محمود اور اُس کا دست راست سالار ابو عبد اللہ محمد الطائی بالکل بے خبر تھے کہ سومات کے اندر ہندوؤں کے بچے بھی مرنے مارنے

دیتے ہیں۔ غور تو اسے مندر پر دھاوا بول دیا۔ وہ دونوں لاشوں کے خون میں انگلیاں ڈبو کر اپنے ماتحتوں پر تلک لگانے لگیں۔ خون کے تلک جب اُن کے مردوں سے دیکھے تو اُن کے خوش و غرض میں ترمیم ہو گیا۔ وہ تو پہلے ہی پھٹکار رہے تھے۔

سومات کی گلیوں میں وہ خبریں جو شہر کی دیواروں کے اوپر سے آتی تھیں، اعلان کے انداز میں سارے شہر کو سنائی جا رہی تھیں اور بہت سی آوازیں گھٹاؤں کی طرح مسلسل گرج رہی تھیں۔ مسلمانوں کو موت یہاں لے آئی ہے۔... بھارت ماتا میں کوئی مسلمان زندہ نہیں رہے گا۔... شیو دیو کے بھائیو! مسلمانوں کی بوٹیاں ہندوؤں میں بھادو... خبر دار... ہوشیار... لڑائی میں جو لڑتا ہوا مارا جائے گا اسے شیو دیو دوسرا جنم دیں گے۔

*

انگریزوں کے دورِ حکومت میں ہندوستان کے سکولوں میں وہ تاریخ پڑھائی جاتی رہی ہے جو ہندوؤں نے لکھی تھی اور جسے انگریزوں نے منظور کیا تھا۔ ان درسی کتابوں میں سلطان محمود غزنوی کے سترو عملوں میں سومات کو آخری حملہ لگایا گیا تھا اور اسے ایک عالم سبکی قسم کا حملہ ثابت کر کے یہ بھی لکھا گیا کہ سومات کا بٹ اندر سے کھوکھلا تھا اور اس میں ہرے جو اہلرت بھرے ہوئے تھے جو محمود غزنوی نکال کر چلے جانا۔ انگریز بھی یہی چاہتے تھے کہ ہندوستان کے مسلمان بچوں کو سومات کے معرکے کے پس منظر اور سلطان محمود کے جذبے سے بے خبر رکھا جائے۔ انگریز ہمیشہ مسلمان سے خائف رہا ہے۔ ہندو کو تو انگریز نے یہاں آتے ہی جسمانی طور پر نہیں بلکہ روحانی طور پر اپنا غلام بنا لیا تھا اور دونوں نے مل کر مسلمانوں کی روایت کشی اور درگوشی کی تھی۔ سومات کی جنگ کے وہ حالات اور احوال و کوائف جو عینی شاہدوں نے تحریر کیے اور جنہیں اُس دور کے مورخ، مفکر اور قانع نگار البرہنی نے قلمبند کیا اور جو فرشتہ اور دیگر بہت سے مورخوں نے محفوظ کیے ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ سومات پر سلطان محمود کی فوج کشی اس قدر بڑا اور خطرناک اقدام تھا جو کوئی ایسا بادشاہ کر سکتا تھا

ہلا کام خندق کو عبور کرنا تھا۔ دیواروں کے اوپر سے اور برجوں سے ہندوؤں نے تیروں کا مینہ برسا دیا۔ سلطان محمود نے اپنے ہزاروں تیر اندازوں کو خندق کے کنارے کھڑے دیواروں اور برجوں پر بلاؤں کے تیر چلاتے رہنے کا حکم دیا۔ غزنی والوں کی گمانیں بڑی تھیں اور سخت بھی۔ ان کے چھوڑے ہوئے تیر ہندوؤں کے تیروں کی نسبت دور مار کر سکتے تھے۔

تیر اندازوں نے ان واحد میں خندق کے کنارے کھڑے ہو کر تیر چلانے شروع کر دیے۔ ان سے ہندوؤں کے سر پیچے ہو گئے اور ان کی تیر اندازی میں کمی آگئی۔ غزنی والوں کی تیر اندازی شدید اور تیز تر ہو گئی۔ اس کے ساتھ میں سلطان محمود کی فوج نے جگہ جگہ سے خندق میں اونٹوں پر بلاؤں کے تیر چلاتے ہوئے پھرتے ہوئے پھرتے ہوئے شروع کر دی۔ یہ عمل ایسا تھا جیسے ایک جگہ سے زمین اکھاڑ کر دوسری جگہ ڈالی جا رہی ہو۔

ہندوؤں نے دیکھا کہ خندق بھرتی جا رہی ہے تو انہوں نے دیواروں پر اپنے آپ کو مسلمانوں کے تیروں کے سامنے کر دیا اور خندق بھرتے والوں پر تیر برسانے لگے۔ وہ مسلمانوں کے تیروں کا نشانہ بن رہے تھے، اگر رہے تھے مگر جو گرنا تھا اُس کی جگہ ایک اور ہندو آ جاتا تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کو خاما خفیانہ پیچھا۔ خندق ابھی آدھی بھری تھی کہ مسلمان تیر انداز اپنے ساتھیوں کو تیروں سے زخمی ہوتا دیکھ کر جو شش میں آ گئے۔ وہ خندق میں کود گئے اور ایک دوسرے کی مدد سے خندق سے اوپر چلے گئے۔ وہ دیوار کے اتنی قریب چلے گئے جہاں سے وہ دیوار کے اوپر کھڑے ہندوؤں کو دیکھ سکتے تھے۔ وہاں سے انہوں نے تیر اندازی شروع کر دی۔

یہ نعرہ اللہ اکبر کا کرشمہ تھا کہ ان تیر اندازوں نے اپنے آپ کو یقینی موت کے خطرے میں ڈال دیا۔ اوپر کے تیران پر موسلا دھار بارش کی طرح آ رہے تھے۔ غزنی کے مجاہد تیر کھاکر بھی تیر چلاتے تھے۔ یہ تیروں کا موہکا تھا۔ خندق بھرتے کے بعد قلعے کے دروازوں اور دیواروں پر ہتھ بولنا تھا۔

کے لیے تیار ہیں اور سومات کا دفاع اس سے کہیں زیادہ مستحکم اور خطرناک ہے جن وہ سمجھتے تھے۔ سلطان خدا کی مدد کا محتاج تو رہتا ہی تھا لیکن یہاں آ کر اُس نے محسوس کیا کہ اُسے کامیابی یا کامیاب پسپائی خدا ہی عطا کر سکتا ہے۔ اتفاق سے وہ چھوٹات کے روز سومات پہنچا تھا۔ فوج کو آرام کی ضرورت تھی لیکن اُس نے جمعہ کے روز حملہ کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ یہ مبارک دن تھا۔ اُس نے اپنے سالاروں کو صرف ایک رات کی ہمت دی کہ وہ اپنے اپنے دستے تقسیم کے مطابق پوزیشنوں پر لے جائیں اور رسد کو اس طرح محفوظ کیا جائے کہ دشمن کے چھاپہ مار اس تک نہ پہنچ سکیں۔ غزنی کی فوج کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ اسے رسد اور کمک ملنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔

صحیح الفاظ میں یوں کہنا چاہیے کہ سومات کا موہکا اسلام اور ہندو مت کا سب سے بڑا موہکا تھا اور یہ دونوں کا ہی موہکا تھا۔ اگر سلطان محمود کو علاقہ فتح کرنا ہوتا اور اُس کا مقصد اپنی سلطنت کی توسیع ہوتا تو وہ اتنی تعبیر نہ آتا۔ شمالی اور وسطی ہند کے کئی علاقوں کو وہ فتح کر چکا تھا۔ اسی کو مستقر بنا کر وہ ان سے ملحق علاقے اپنی سلطنت میں شامل کر سکتا تھا۔

✱

روز جمعہ ۷ جنوری ۱۰۲۶ء (۵ ذی قعدہ ۴۱۶ ہجری) غزنی کی فوج میں اذان کی صدائے مقدس گونجی اور احکام کے مطابق تمام فوج نے اجماعت نماز پڑھی۔ سلطان محمود بھی فوج کی کسی صف میں کھڑا تھا۔ امام نے گڑگڑا کر فتح کی دعا مانگی اور اس کے فوراً بعد فوج نے سومات کا محاصرہ کر لیا۔ اس محاصرے میں سب سے نمایاں چیز جو تمام مورخوں نے لکھی ہے وہ غزنی کی فوج کے نعرے تھے جو اس قدر گرجا رہے کہ خوف کا تاثر پیدا کرتے تھے۔ اس کے جواب میں قلعے کی دیوار پر ہندوؤں کا جو جوم تھا، وہ اپنے نعرے لگا رہا تھا۔

سلطان محمود کی ایک جگہ کھڑا ہو کر احکام نہیں دے رہا تھا۔ وہ مسلسل حرکت میں تھا۔ اُس کے قاصد اور محافظ اس کے ساتھ بھاگ دوڑ رہے تھے۔ سب سے

کہا گیا کہ وہ کشتیاں دیوار تک لے چلیں۔ کشتیوں میں بیڑھیاں بھی رکھ لی گئی تھیں۔ یہ کوشش بھی ناکام ہو گئی کیونکہ دیوار کے اوپر سے تیر آنے لگے۔ ہندو ملاح مسند پر کر دئے غزنی کے مجاہدوں نے خود چھوڑ دئے لیکن دیوار تک پہنچنا خود کشتی کے برابر تھا۔

جمعہ کی نماز کا وقت ہو گیا۔ خندق کو ابھی تک بھڑا جا رہا تھا تاکہ آگے پیچھے ہونے کی رفتار تیز کی جاسکے۔ دونوں فوجوں کا خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ سلطان محمود نے (مورخوں کے مطابق) گھوڑے پر ہی دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور دعا ختم کر کے اُس نے شدید پلہ بولنے کا حکم دے دیا۔ وہ خود پیچھے کھڑا نہ رہا۔ بہت آگے چلا گیا۔ وہ فوج کا حوصلہ بڑھانے کے لیے چرخ چلا رہا تھا۔

یہ پلہ اس حد تک کامیاب رہا کہ دروازے کے بالکل اوپر اور دروازے کے ساتھ دائیں اور بائیں جو مورچہ نما برج بنے ہوئے تھے، انہیں صاف کر دیا گیا اور غزنی کے سپاہی اس طرح ان کم بندی والے مورچوں میں کھڑے ہو گئے کہ اندر سے کوئی الٹا نہیں آکر تیر نہیں چلا سکتا تھا۔

ہندوؤں نے دلیری کا یہ مظاہرہ کیا کہ قلعے کا ایک دروازہ کھول دیا۔ اندر سے گھوڑ سوار ہاتھوں میں برھیاں لیے تیز رفتار سے آئے اور ایسا پلہ بولا کہ خود دیواروں سے گئے لیکن غزنی والوں کو پیچھے دھکیل دیا۔ سلطان محمود نے حکم دیا کہ کھلے ہوئے دروازے میں گھس جاؤ۔ ایک ہی بار بہت سے سواروں نے گھوڑوں کو اتر لگا دی مگر اندر سے اتنے ہی گھوڑے سرپٹ دوڑتے آئے۔ ان کا کمر اور دروازے میں ہوا۔

اندر سے مزید سوار آئے۔ انہوں نے غزنی کے سواروں کو دروازے کے اندر نہ جانے دیا۔ مورخ لکھتے ہیں کہ دونوں طرف کے سپاہی ایک دوسرے سے زبردستی کے پیا سے نظر آتے تھے۔ غزنی والوں نے تو جیسے نہ ہر کر لیا تھا۔ فتح یا موت۔ وہ سربا قہر بن گئے تھے اور ہندو ان قہر کو اپنے سینوں پر

خندق اتنی بھر گئی کہ فوج گزر سکتی تھی۔ چار گھوڑ سواروں نے ہاتھوں میں کھڑا رہنے لگے۔ سرپٹ دوڑا دیئے۔ ان کا رخ ایک۔ دروازے کی طرف تھا۔ ان کا ارادہ تھا کہ دروازے تک پہنچ جائیں تو کھانڈوں سے دروازہ توڑیں گے مگر دو تو راستے میں ہی تیروں کاٹا نہ بن گئے۔ ان پر اتنے تیر آئے کہ گھوڑوں کے جسموں میں بھی تیر اتر گئے۔ دروازے تک پہنچ گئے مگر دروازے کے دیوار بائیں دیوار میں چوڑے سوراخ تھے جن میں دروازے کی حفاظت کے لیے تیر انداز بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے دونوں سواروں کو ختم کر دیا۔

غزنی کی فوج بند توڑ کر نکل جانے والے سیلاب کی طرح بڑھی۔ ان دستوں کے پاس بڑی مضبوط بیڑھیاں تھیں جن کی لمبائی دیواروں کی لمبائی جتنی تھی۔ عقب سے تیر اندازوں نے دیوار کے اوپر اور برجوں پر تیر اور تیزی سے پھینکنے شروع کر دیئے تاکہ اوپر والوں کے سر پہنچے رہیں لیکن ہندوؤں نے جان کی بازی لگا رکھی تھی۔ انہوں نے سر پیچھے نہ کیے اور ان مسلمانوں پر تیر برسائے شروع کر دیئے جنہوں نے بیڑھیاں اٹھا رکھی تھیں۔

دروازے تک پہنچنا ناممکن نظر آ رہا تھا، پھر بھی کچھ جاننا ایسی پوزیشنوں تک پہنچ گئے جہاں سے وہ دروازے کے ساتھ والے سوراخوں میں تیر چلا سکتے تھے۔ ان میں بعض مارے گئے لیکن غزنی والوں کا جوش اور جذبہ پہلے سے زیادہ بڑھ گیا تھا۔ بیڑھیاں دیواروں کے ساتھ لگادی گئیں مگر ان پر جو بھی چڑھا وہ جسم میں دھین تیر لیے ہوئے گرا۔

ادھر دیواروں پر چڑھنے کی کوشش ہو رہی تھی، ادھر مسند کی طرف ایک مورچہ لڑا جا رہا تھا۔ قلعے کا تمام تر کھوپڑا مسند میں تھا۔ ایک نائب سالار نے زبردستی حکم دیا کہ مسند میں کشتیاں ڈال کر دیوار تک پہنچا جائے اور دیوار پر چڑھنے کی کوشش کی جائے۔ غزنی کی فوج کے پاس اپنی کشتیاں نہیں تھیں مسند کا کارہ کشتیوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہ سومات کی فوج کی کشتیاں تھیں۔ ایک خلیفہ کشتیوں میں سوار ہو گیا۔ جنوری کا مہینہ تھا، اس لیے مسند میں جوش نہیں تھا۔ کشتیوں کے ملاح ہندو تھے۔ انہیں

دروازہ کھولنے کی چال سومات کے ہمارا جو کنور رائے کی تھی وہ غزنی کی فوج کو نقصان پہنچانے میں خاصی حد تک کامیاب تھا مگر اُس کا متقابلہ غزنی کے جس جرنیل سے تھا، وہ اُس سے زیادہ دانش مند تھا اور وہ ہر موقع سے فائدہ اٹھانے کی اہلیت رکھتا تھا۔ سلطان محمود اور اُس کے سالار اعلیٰ ابو عبد اللہ نے دروازہ کھلنے سے یہ فائدہ اٹھایا کہ اپنی فوج کے بہت سے آدمی دروازے کے درمیان والے بڑوں اور مردوں میں کھڑے کر دیئے جہاں سے انہوں نے بڑی کارگر تیر اندازی کی۔ اُدھر فوج دیواروں پر چڑھ رہی تھی۔

ہمارا جو کنور رائے نے یہ صورت حال دیکھی تو اندر سے ایسا جھک کر آیا کہ بند کھڑکھڑا کر غزنی والوں کو دھکیلتے ہوئے باہر لے گئے اور ان کے پیچھے دروازہ بند ہو گیا۔ ہندو سواروں نے اپنا آپ سومات پر قربان کر دیا۔ وہ اندر نہیں جاسکتے تھے۔ دروازہ بند ہو چکا تھا۔ وہ مسلمانوں کے ہاتھوں کٹ گئے۔ جو مسلمان بڑوں پر قابض ہو گئے تھے ان پر ہندو ٹوٹ پڑے۔ وہ سب بڑے ہوئے کام آئے۔ اس کے ساتھ ہی سومات کی فوج بے بیڑھیوں کے ذریعے اوپر آنے والے مسلمانوں پر اس قدر خیر برساتے کہ مسلمان ایک دوسرے کے اوپر گرے، اور جو اوپر چلے گئے تھے ان میں سے شاید ہی کوئی زندہ رہا ہو گا۔

دیوار کے اوپر سے اب تیروں کے ساتھ برجھیاں بھی برستے تھیں سلطان محمود نے دیکھا کہ سورج قلعے کے نیچے چلا گیا ہے اور فوج ٹھک گئی ہے اور زمینوں کی تعداد بھی بڑھتی جا رہی ہے تو اُس نے یہ بھی ہٹ آنے کا حکم دے دیا۔

وہ رات بھر سو رہے تھے۔ سالاروں کو احکام دیتا رہا۔ اُس نے زمینوں کی عیادت بھی کی اور وہ ان دستوں کو دیکھتے بھی گیا جو باہر سے آنے والی ہندو فوجوں کے انتظار میں تھے۔ وہ کچھ فکر مند بھی تھا۔ اُسے کامیابی محذوش نظر آ رہی تھی لیکن وہ مار مارنے والا آدمی نہیں تھا۔

اگلی صبح طلوع ہوتے ہی اُس نے جوش و خروش سے قلعے پر قبضہ کر لیا۔ سپاہیوں نے دیواروں کے ساتھ بیڑھیوں لگالیں مگر ہندو قلعے نے انہیں اوپر نہ جانے

یہ اطلاع اندر پہنچ گئی کہ غزنی کی فوج نے دروازہ کھول لیا ہے۔ اوپر والے ہندو تیر انداز ایسی جگہ آگئے جہاں سے وہ دروازے پر تیر چلا سکتے تھے۔ انہوں نے تیر برسانے شروع کر دیئے۔ دیوار پر بیغلط اطلاع بھی پہنچی کہ غزنی کی فوج قلعے میں داخل ہو گئی ہے۔ اوپر والے مسلمانوں کو روکنے کے لیے قلعے کے اندر اتر گئے۔ مسلمانوں کی قیادت بڑی تیز اور ذہین تھی۔ انہوں نے فوراً دیوار کے ساتھ بیڑھیاں لگالیں اور سپاہی ایک دوسرے کے پیچھے اوپر چڑھ گئے۔ ان کے پیچھے فوج چڑھ جا رہی تھی۔ لنگے لے دیوار کے اوپر دست بدست لڑائی شروع ہو گئی۔

مند تک خبر پہنچ گئی کہ مسلمان اندر آ گئے ہیں۔ تمام پنڈت جو عبادت میں مصروف تھے، اس طرح جگہ سے اٹھ کر بیٹھ گئے کہ بیٹھ کے بن لیت کر مٹھے فرش پر گر گئے۔ چونکہ دروازہ ابھی کھلا تھا اس لیے غزنی کے لشکر کے لئے مندر کے اند تک سنائی دے رہے تھے۔ پنڈت اور دیگر باری سپاہی نہیں تھے۔ وہ لڑنا نہیں جانتے تھے۔ سلطان محمود نے اپنا اصول بنا رکھا تھا کہ وہ بُت توڑ دیتا، مندر کو جاڑ دیتا مگر کسی پنڈت اور باری پر ہاتھ نہیں اٹھاتا تھا۔

سومات کے مندر میں پنڈتوں کو پتہ چلا کہ دروازہ کھل گیا ہے اور مسلمان اندر آ گئے تو وہ بُت کے آگے لیٹ گئے، اور جب اللہ اکبر کے نعروں کی گرج ان کے کانوں تک پہنچی تو چند ایک پنڈت اٹھ کھڑے ہوئے۔ دیو پری مورخوں ہیگ اور سکھانے لکھتے ہیں کہ مندر میں سینکڑوں نیم عرباں رقصا میں موجود تھیں۔ ان کا دھنس رگ گیا تھا۔ وہ شاید سمجھ گئی تھیں کہ ان کا دیوتا مار گیا ہے۔ ان کے چہروں پر گھبراہٹ تھی۔ چند ایک پنڈت اٹھے اور یہ سمجھ کر ان کی زندگی کا آخری وقت آ گیا ہے، ایک ایک رقصہ کو پکڑا اور مندر سے ہٹ کر دیواروں میں لے گئے۔ اس طرح مندر میں ہکاری شروع ہو گئی۔ شہری اس سے بے خبر تھے۔

شہریوں پر خوف و ہراس نہیں تھا۔ مردوں کے ساتھ عورتیں بھی ہتھیاروں سے لیس ہو کر نکل آئی تھیں۔ بوڑھی عورتیں مندر میں اکٹھی ہو کر عبادت میں مصروف ہو گئی تھیں۔

دیا۔ سارا دن یہ عمل جاری رہا لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ شام کو اُس نے دستے پیچھے ہٹا لیے۔

*

۹ جنوری ۱۰۲۶ء بروز اتوار، مہاراجہ کنور رائے نے ایک دلیرانہ چال چلی۔ اُس نے صبح کی روشنی صاف ہونے سے پہلے قلعے کا دروازہ کھول دیا۔ اندر سے کچھ دبستے باہر آئے جنہوں نے غزنی کی فوج کے کیمپ پر قبضہ کر لیا۔ ہندوؤں کا خیال ہو گا کہ غزنی کی فوج ابھی سوئی ہوئی ہوگی یا ابھی تیار نہیں ہوگی، لیکن وہ نماز کا وقت تھا اور فوج ابھی ابھی نماز سے فارغ ہوئی تھی۔ ہندو فوج گھوڑوں پر تھی۔ غزنی کی فوج کو گھوڑوں کی تیاری کی بہت بڑی کمی تھی۔ سلطان محمود نے فوری طور پر دائیں اور بائیں اس حکم کے ساتھ قاصد فرمادیتے کہ ہندوؤں کی فوج کو گھیرے میں لے لو۔ ہندو بڑی دلیری سے آتے تھے مگر وہ دیکھ نہ سکے کہ انہیں گھیرے میں لیا جا رہا ہے۔

غزنی کے ایک دستے نے یہ حکم کیمپ سے دور روک لیا اور اس کے ساتھ ہی ہندو دستوں پر دائیں اور بائیں سے حملہ ہو گیا۔ ہندوؤں کو یہ چال بہت ہنگامی پڑی مگر مکرر آتشباری اور صبر آزمائی کا تھا کہ سلطان محمود کی فوج کا بھی دم خم توڑ گیا۔ کچھ ہندو سوار گھیرے سے نکل گئے اور قلعے کی طرف بھاگے۔ اُن کے لیے دروازہ کھل گیا۔ غزنی کے بہت سے مجاہد اُن کے تعاقب میں گئے مگر سلطان محمود نے انہیں روک لیا۔ قلعے کا کھلا ہوا دروازہ اُن کے لیے موت کا پھندہ ثابت ہو سکتا تھا۔

ہندو ایسی دلیری کے مظاہرے کر رہے تھے جنہوں نے سلطان محمود کو اپنی حکیم پر نظر ثانی پر مجبور کر دیا۔ ہندوؤں کے ساتھ اس کا یہ معرکہ کیا نہیں تھا لیکن یہاں ہندوؤں کے لئے کا اندازہ بنا بلکہ حیرت میں ڈال دیتے والا تھا۔ سلطان سوجہ ہی رہا تھا کہ اُسے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے کہ ایک طرف سے شور مچا۔ ایسے شور سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔ قلعے کا دوسرا دروازہ کھل گیا اور سو منات کے دو سوار اور ایک پیادہ دستے نے باہر آکر برقی رفتار حملہ کر دیا مگر اب غزنی والوں کی یہ چال بے کار ہوئی

نظر آ رہی تھی کہ دشمن پر دائیں اور بائیں سے حملہ کریں کیونکہ دیواروں کے اوپر اور برجوں میں تیرا اندازوں کا ایک جھوم تھا جو اپنے حملہ آور دستوں کو پہلوؤں سے پیروں کی بارش سے محفوظ کیے ہوئے تھا۔

سالار ابو عبد اللہ نے یہ چال چلی کہ اپنے دستوں کو یعنی محاصرے کو پیچھے ہٹانے کا حکم دیا۔ اسے توقع تھی کہ ہندو سوار آگے آجائیں گے اور انہیں ایک ٹو گھیرے میں لیا جائے گا، دوسرے یہ کہ قلعے کا دروازہ توڑنے یا دھکیلنے کا موقع مل جائے گا، مگر مہاراجہ کنور رائے کا داغ پوری طرح کام کر رہا تھا اور وہ غیر معمولی جنگی ذہانت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اُس نے اپنے دستوں کو دھن نشین کر دیا تھا کہ قلعے کی دیوار سے اتنے فاصلے سے آگے نہ جائیں خواہ کچھ ہی ہو جائے۔ انہوں نے ابو عبد اللہ کی چال بے کار کر دی۔ وہ آگے نہیں آ رہے تھے۔

ہندوؤں کی دلیری کا یہ عالم تھا کہ وہ آگے آئے کی بجائے دائیں بائیں کھٹ گئے اور انہوں نے محاصرے پر جگہ جگہ حملے شروع کر دیئے۔ وہ محاصرہ توڑنے کی اور غزنی والوں کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان پر جنوبی کیفیت طاری تھی جیسے کوئی کشتی کر آئے ہوں۔ یہ مذہب کا جنون تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اُن کا جنون بالکل اپن گیا جس کا باعث یہ ہوا کہ قلعے کی دیواروں سے جہاں سے پیروں کا مینہ برس رہا تھا، نسوانی آوازیں آنے لگیں۔ یہ عورتوں کی المکاری تھی۔ وہ اپنے سپاہیوں کو طرح طرح کے نعروں سے گرا رہی تھیں۔ ان میں ایک آواز یہ تھی۔

”تمہاری ماؤں بیٹوں کو مسلمان اٹھالے جاتیں گے۔“ عورتوں کی جیخ دیکار ایسی تھی جیسے وہ کسی ظالم اور درندے کے چنگل میں آگئی ہوں۔

صورت حال اس قدر خوفناک اور غزنی والوں کے لئے اس قدر مخدوش ہو گیا کہ (محمد تاقم فرشتہ اور البرونی کے مطابق) سلطان محمود نے اپنا مرکز اپنے مشیروں وغیرہ کے حوالے کر کے ایک قلعہ بننے کی قیادت سنبھال لی اور ہندوؤں پر جوابی حملہ کیا۔ سب سے بڑی مشکل اوپر سے آنے والے پیروں اور برجیوں نے پیدا کر رکھی تھی۔ سلطان محمود نے اپنے آپ کو ایک ہولناک خطرے میں ڈال دیا تھا۔ غزنی کی فوج کو ہرپاکنے

کے لیے اب صرف ایک تیر کی ضرورت تھی جو سلطان محمود کو لگنا اور جنگ ختم ہو جاتی۔ ابو عبد اللہ محمد الطائی نے سلطان کی یہ دلیری اور یہ جذبہ دیکھا تو اُس نے ایک تیر انداز دستے کو حکم دیا کہ وہ دیوار کے اتنی قریب چلا جائے جہاں سے اوپر کے تیر انداز نظر آتے رہیں اور تیروں کا نشانہ بھی نہ بن سکیں۔ اس دستے نے دیکھ لیا تھا کہ سلطان قلب سے آکر ایک دستے کی قیادت کر رہا ہے۔ اس دستے کے تیر اندازوں نے جان کی بازی لگا دی۔ اب صورت یہ پیدا ہو گئی کہ دونوں طرفوں کے تیر ہوا میں کھرا رہے تھے۔ غزنی کے تیر انداز اوپر سے آتی ہوئی ہر چھپوں سے مر رہے تھے مگر انہوں نے تیر اندازی میں سُستی پیدا نہ کی۔

ابو عبد اللہ کی اس چال کا یہ فائدہ ہوا کہ اوپر کے تیر اندازوں کا رخ سلطان محمود کے دستے سے ہٹ کر دوسری طرف ہو گیا۔ ایک اور فائدہ یہ ہوا کہ غزنی کے دوسرے دستوں نے اپنے تیر اندازوں کی یہ جانبازی دیکھی تو ان میں نیا ہی جوش بلکہ قہر پیدا ہو گیا۔ وہ احکام کے بغیر آگے چلے گئے اور اس قدر تیر برسا ئے کہ دیوار سے ہندو تیر انداز باہر کی طرف بھی گرنے لگے۔

جو ہندو دستے باہر آئے تھے، وہ جانبازی سے لڑ رہے تھے لیکن وہ اُس حفاظت سے محروم ہو گئے جو دیوار کے اوپر سے انہیں تیر انداز دے رہے تھے۔ سالار ابو عبد اللہ کی نظر سلطان محمود پر تھی۔ سلطان پر جیسے دیوانگی طاری ہو گئی تھی لیکن وہ دماغ کو اپنے قابو میں رکھے ہوئے تھا۔ اُس نے ایسی چال چلی کہ ہندو دستے بکھرنے پر مجبور ہو گئے۔ ابو عبد اللہ نے دشمن کو پھرتے دیکھا تو ایک سوار دستہ قلعے کی دیوار کی طرف سے ہندوؤں پر حملے کے لیے بھیج دیا۔ سیکڑوں گھوڑے سر پیٹ دوڑنے لگے۔ ہندو بکھلا گئے۔ انہوں نے غزنی والوں کا بہت نقصان کیا تھا لیکن وہ خود بھی تیزی سے ختم ہو رہے تھے۔

ان میں جو بچ گئے تھے وہ دروازے کی طرف بھاگنے کی کوشش کرنے لگے لیکن مارا جہ کنور رائے ایسا احمی نہیں تھا کہ اُن کے لیے دروازہ کھول دیتا۔ وہ برج میں کھڑا دیکھ رہا تھا کہ غزنی کی فوج ایسی پوزیشن میں آگئی ہے کہ دروازہ کھلا

اور یہ سیلاب کی طرح اندر آجائے گی۔ اُس نے اپنے ان دستوں پر کبیر بھیر دی۔ ان میں سے کوئی بھی اندر نہ جاسکا نہ کوئی زخمی رہا۔ سلطان محمود کا اصول کچھ اور تھا لیکن سالار ابو عبد اللہ نے کانوں کان اپنے نائبین کو اور ان کی معرفت تمام کمانداروں سے کہہ دیا تھا کہ کوئی جنگی قیدی نہیں چاہیے۔ ہلاک کر دو۔ دشمن کا کوئی آدمی کسی بھی حالت میں سامنے آئے، ہلاک کر دو۔ اب تو جنگ کی صورت ایسی ہو گئی تھی کہ لڑنا اور رہنا تھا جنگی قیدیوں کو کہاں سنبھالتے۔ البتہ دشمن کے تندہ دست گھوڑے اور سنبھارا جمع کرنے کا حکم دے دیا گیا تھا۔ دلوں قیدیوں کی نسبت گھوڑوں اور ہتھیاروں کی ضرورت زیادہ تھی۔

✽

”کیا آپ نے ہندوؤں کو پہلے کہیں اس طرح لڑتے دیکھا تھا؟“ رات کو سلطان محمود نے اپنے سالاروں، ان کے نائبین اور کمانداروں سے کہا۔ اُس نے چھوٹے درجے کے عہدیداروں اور کمانداروں کو بھی بلایا رکھا تھا۔ اُس نے کہا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس جگہ کو ہندو کتنا مقدس سمجھتے ہیں۔ میں نے آپ سب کو اس لیے بلایا ہے کہ اپنے سپاہیوں کو بتا دو کہ ہندوؤں کا مذہبی جنون دیکھو اور یہی جنون اپنے آپ میں پیدا کر دو۔۔۔ انہیں میری طرف سے خراج تحسین پیش کرنا۔ انہوں نے آج احکام کے بغیر جو مظاہرے کیے ہیں، ان کا صلہ انہیں خدا دے گا۔ اس جذبے میں فرق نہ آئے۔ پائے۔ میں کوئی پیش گوئی نہیں کر سکتا کہ کل کیا ہوگا اور اس جنگ کا انجام کیا ہوگا۔ میں اپنی فوج کے مجاہدوں کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اگر ہم یہاں ہار گئے تو آنے والی شعلیں بھی کہیں گی کہ ہندوؤں کا شو دیو سچا تھا اور انسانوں کی زندگی اور موت اسی کے ماتھے میں تھی اور اسلام کوئی مذہب نہیں، ہمارے بعد آنے والے لوگ ہمیں لڑا اور قاتل کہیں گے۔ ہمیں اسلام کی عظمت اور صداقت کا ثبوت دینا ہے یا ہمیں ختم ہونا ہے۔ اس جنگ کو آپ عالم قسم کی جنگ نہ سمجھ لینا۔ کل کا دن آج کے دن سے زیادہ جاں لیوا اور ہمت آزا ہوگا۔ آپ کو تاریخی میں ایک نقش چھوڑنا ہے تاکہ قیامت تک جو غزنی کا نام لے سونمات کا نام بھی طرزد

لے اور کہے کہ سومات غزنی کے قدموں میں پڑا ہے۔

سلطان محمود نے انہیں جنگی نوعیت کی ہدایات دیں اور انہیں کہا کہ یہ جنگ بہت جلد ہی ختم کرنی ہے کیونکہ نغری کم ہو رہی ہے، اور رسد میں بھی تیزی سے کمی آ رہی ہے اور یہ کمی پوری کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ پہلا دشمن غل مند اور دیر ہے لیکن وہ یہ طریقہ نہیں سوتجہ سے کہ ہم پر حملہ کرنے کی بجائے دفاع میں لڑنا رہے۔ اور کاہرہ طویل ہو جائے تاکہ ہم اپنی رسد ختم کر دیں۔ وہ ہمیں تیروں سے نہیں ٹھوکرے۔ سے مار سکتا ہے۔ پیشتر اس کے کہ دشمن یہی چال چل جائے وہیں شہر میں داخل ہونا ہے۔ میں بھوک اور زخمی بی کی طرح نہیں، شہر کی طرح شہر میں داخل ہونا چاہتا ہوں۔

غزنی والوں نے یہ رات بھی جاگتے گزار دی۔

✱

سلطان محمود نے ان لوگوں کو رخصت کیا تو اسے اطلاع دی گئی کہ ایک ہندو رشی جو بہت بوڑھا ہے ایک نوجوان لڑکے کو ساتھ لایا ہے۔ وہ سلطان سے ملنے آیا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ وہ قلعے میں سے آیا ہے۔ اُس کی اور لڑکی کی جامعہ تلاش لے لی گئی تھی۔ سلطان نے اس خیال سے انہیں بلایا کہ سراجہ کنور رائے کا کوئی پیغام ہو گا جو صلح کا بھی ہو سکتا تھا، دھمکی کا بھی اور کسی سودا بازی کا بھی۔

وہ بوڑھا سر سے پاؤں تک بک بک گیا لباس میں تھا اُس کے بال غورتوں کی طرح لمبے اور اس کی داڑھی بھی لمبی تھی۔ وہ بوڑھا تھا اور اس کے بال زیادہ تر سفید تھے لیکن اس کی آنکھوں میں جوانی کی چمک اور چہرے پر ایسی رفتی تھی جو ہندوؤں کے چہروں پر کم ہی ہوا کرتی تھی۔ سلطان محمود اس سے متاثر ہوا۔ اس بوڑھے کے ساتھ جو لڑکی تھی، وہ چادر میں تھی۔ اس کا سر اور آدھا چہرہ بھی ڈھانپا ہوا تھا۔ بوڑھے نے اُس کے سر سے چادر اتار دی۔ سلطان محمود نے چونک کر لڑکی کو دیکھا۔ اُس نے اتنی دل کش لڑکی کبھی نہیں دیکھی تھی، یا اُس نے کسی عورت کو کبھی غور اور دیکھی سے نہیں دیکھا تھا۔ اس لڑکی نے اُس کی نظروں کو گرفتار کر لیا۔

”آپ کیوں آئے ہیں؟“ سلطان محمود نے بوڑھے سے پوچھا۔ کیا آپ کو سومات کے مہاراجہ نے بھیجا ہے؟“ اُس نے دونوں کو بٹھالیا۔ وہ اس بوڑھے کے ساتھ اسی علاقے کے ایک سلطان کے ذریعے بات کر رہا تھا۔

”میں مہاراجہ کی طرف سے کوئی پیغام نہیں لایا۔“ بوڑھے نے کہا۔ اُس کے لب دہیے میں ایک تاثیر تھا جو سلطان نے محسوس کیا اور وہ سمجھ گیا کہ یہ بوڑھا معمول آدمی نہیں۔ بوڑھا کہہ رہا تھا۔ ”میں مہاراجہ کی اجازت سے آیا ہوں۔ اُس نے مجھے چار گھوڑ سواروں کے ساتھ قلعے سے نکال کر راستہ دکھایا تھا۔ میں اپنا پیغام لایا ہوں۔ میں سومات کا پندرت نہیں۔ میں یہاں ہر سال پندرہ بیس دنوں کے لیے آیا کرتا ہوں۔ میرا ٹھکانہ ہمالیہ کے دامن میں ہے جہاں برف جمی رہتی ہے۔ اب بھی یہاں چند دنوں کے لیے عبادت کرنے آیا تھا کہ آپ آگئے۔ آپ نے تین دنوں میں دیکھ لیا ہے کہ سومات کے رہنے والے کس طرح قہر بنے ہوئے ہیں۔ اپنے نقصان کو دیکھیں۔ آپ پر جو قہر برسا ہے وہ سومات کے انسانوں کا نہیں، یہ اُس دیوتا کا قہر ہے جس کے پاؤں سمندر میں اور سر آسمانوں میں ہے۔ میں اُس کا خاص بچاری ہوں۔“

”کیا آپ مجھے اپنے دیوتا سے ڈرانے آئے ہیں؟“ سلطان محمود نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ اور اس لڑکی کو آپ ہندوؤں کے رواج کے مطابق تھکے کے طور پر لائے ہیں؟“

”اپنے آپ کو گمراہ نہ ہونے دیں سلطان!۔“ بوڑھے رشی نے کہا۔ میں نہ ڈرانے آیا ہوں نہ کوئی تھک لایا ہوں۔ میں آپ کے غامدے اور آپ کی نجات کے لیے آیا ہوں۔ میں آپ کو ایک پیشکش کرنے آیا ہوں۔ شوہر کی طاقت سے آپ واقف نہیں۔ اس طاقت کا صرف ایک ذرہ شوہر نے مجھے دیا ہے۔ یہ ذرہ ایسا ہی ہے جیسے پھر میں ریت کا ایک ذرہ یا سمندر میں پانی کا ایک قطرہ۔ اس ایک ذرے اور ایک قطرے کی طاقت دیکھنی ہے تو دکھا دوں گا۔ اس سے آپ اس دیوتا کی طاقت کا اندازہ کر سکیں گے۔“

”اور یہ لڑکی“

”یہ زندہ نہیں، ایک رُوح ہے۔“ بوڑھے نے کہا۔ ”آپ کو شاید کسی نے بتایا نہیں کہ جو مر جاتا ہے اُس کی رُوح سومات میں آجاتی ہے۔ یہ رُوح بڑی دُور سے آئی تھی۔ میں نے آج اسے حاضر کیا اور اسے اپنے ساتھ لے آیا۔ اگرچہ میں نہ کہے تو میں اسے ہوا میں معلق کر کے دکھا سکتا ہوں۔“

اُس نے لڑکی کا سر اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لے لیا اور اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سرگوشیوں میں کچھ کہا۔ لڑکی کا سر ڈولنے لگا۔ بوڑھے نے اُسے بائفل پر اٹھایا اور اُسے کہا: ”تم پلنگ پر سو۔“ ناگیں اور سر سیدھا کر لو۔“ لڑکی کا جسم لپٹا سیدھا ہو کر اگر لگیا جیسے پلنگ پر لاش پڑی ہو لیکن وہ بوڑھے کے ہاتھوں پر تھی۔ بوڑھے نے اپنے بازو اُس کے پیچے سے نکال لیے۔ لڑکی اکڑی ہوئی ہوا میں معلق رہی۔ بوڑھے نے لڑکی کی چادر اُس پر اس طرح ڈال دی کہ وہ سر سے پاؤں تک چادر میں چھپ گئی۔

سلطان کے دو محافظ خیمے کے دروازے میں اندر کھڑے تھے۔ بوڑھے رشی نے ایک محافظ سے کہا: ”تلوار نکالو اور اس لڑکی کے پیٹ پر اتنی طاقت سے وار کرو کہ اس کا جسم دو حصوں میں بٹ جائے۔“

محافظ نے سلطان کی طرف دیکھا۔ وہ بغیر اجازت کوئی حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ سلطان نے اُسے اشارہ کیا کہ بوڑھے نے جو کہا ہے وہ کرو۔ محافظ نے تلوار نکال لی اور پوری طاقت سے لڑکی کے پیٹ پر وار کیا مگر وہاں کسی کا پیٹ نہیں تھا جو کٹ جاتا۔ صرف چادر تھی جو تلوار کے ساتھ لپٹ کر زمین پر جا پڑی۔ لڑکی غائب تھی۔ حیرت سے محافظ کا رنگ پیلا پڑ گیا لیکن سلطان محمود مسکرا رہا تھا۔

”یہ جسم نہیں تھا۔“ بوڑھے نے کہا۔ ”تلوار سے آپ جسم کو کاٹ سکتے ہیں، رُوح کو نہیں۔ اگر آپ حکم دیں تو میں آپ کو کھوڑی سی دیر کے لیے اُس دیس میں بھیج سکتا ہوں جہاں سے یہ رُوح آئی تھی۔“

دو قانع نگاروں، ابن ظہیر اور سبط ابن الجوزی نے اُس دور کی ایک تحریر

کا حوالہ دے کر یہ واقعہ کچھ اختصار سے بیان کیا ہے۔ ایک بار سلطان محمود کے پیر و مُرد شیخ الواکسن خرقانی نے اُسے کہا تھا کہ ہندوستان جادو گر دن اور شنبہ بارہ کی حسین سرزمین ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم یا تمہارے سالار یا انتظامی شعبوں کے وہ حکام جو ہندوستان کے مفتوحہ علاقوں میں رہتے ہیں، اس جادو اور شنبہ بازی کے اسیر ہو جائیں۔ ہندو وہ قوم ہے جو یہودیوں اور نصرا نیوں کی طرح اپنی خوبصورت بیٹیوں کے ذریعے اپنے دشمن کو اُسی طرح پھانس کر جو محس لیتی ہے جس طرح مکڑی کھٹی کو اپنے جالے میں پھانس لیتی ہے۔ شیخ خرقانی نے سلطان کو تفصیل سے بتایا تھا کہ ہندوستان میں کیسی کیسی شنبہ بازیوں ہوتی ہیں۔

سلطان محمود خود بھی عالم تھا اور اُسے علم و دانش سے گہری دلچسپی تھی۔ اُس نے ہندوستان کے متعلق بہت کچھ پڑھا اور سنا تھا۔ وہ ہزار ہا جی قیدیوں کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ ان میں علم و فضل والے لوگ بھی تھے۔ ان سے اُس نے بہت کچھ حاصل کیا تھا۔ بعض باتیں سُن کر وہ حیران رہ جاتا تھا اور بعض شعبہ دے دیکھ کر اُسے یقین نہیں آتا تھا کہ کسی انسان میں ایسی شنبہ بازی کی طاقت ہوتی ہے۔ اُس نے ہالیہ میں زندگی بسر کرنے والے لوگوں کے قصے بھی سُنے تھے جن میں سے بعض نے ایسی طاقت حاصل کر رکھی تھی کہ نصف گھنٹے سے بھی زیادہ دیر تک نہ صرف اپنی سانس روک سکتے تھے بلکہ اپنے دل کی حرکت تک ساکن کر لیتے تھے۔ انھیں ہرگز جانی نہیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ شخص زندہ ہے مگر وہ دل کی حرکت خود ہی رواں کر کے زندہ ہو جاتے تھے۔ یوگاین ساڑھے تین ہزار سال پُرانا علم یا طریقہ تھا جس میں مہارت حاصل کر کے لوگی تندرست کو مریض اور مریض کو تندرست کر لیا کرتے تھے۔

لوگ (یوگا) کو آج کے سائنسدان اور ماہرین طب و نفسیات اہمیت دے رہے ہیں۔ اس میں اپنے آپ کو اور دوسروں کو چٹانا مار کر کرنے کے طریقے خاص طور پر شامل ہیں، اور اس میں ایلی ٹیجی بھی شامل ہے جسے جدید علم نفسیات اپنی اختراع سمجھتا ہے۔ یہ دراصل ہزاروں سال پہلے کے لوگوں کے

ہے؟ مجھے متبارے جسم اور متبارے حسن کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔ میں تہیں عزت سے زحمت کروں گا اور مجھے یہ بھی بتا دو کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔“

لڑکی نے ترجان کی طرف دیکھا اور اسے کہا ”تم باہر چلے جاؤ۔“
ترجان نے سلطان کو بتایا کہ لڑکی اسے باہر جانے کو کہہ رہی ہے۔ سلطان نے لڑکی کو خوشگلیں لگا ہوں سے دیکھا اور بڑی دھڑکی آواز میں کہا ”اگر تم یہاں مرنے کے لیے آئی ہو تو میں تمہاری موت کا انتظام فوراً کروں گا لیکن تمہاری موت تلوار کے ایک دار سے نہیں ہوگی۔ نہیں ٹخنوں سے باندھ کر رسی گھوڑے کے پیچھے باندھ دی جائے گی اور گھوڑا شہر کے دروازے کی طرف دوڑا دیا جائے گا۔ وہاں تک تمہاری حریف بڑیاں رہ جائیں گی۔“

لڑکی نے بتایا کہ اسے مندر کے سب سے بڑے پنڈت اور مہاراج نے اپنے پاس بلا کر کہا تھا کہ اس بوڑھے کے ساتھ جاؤ۔ اگر اسے سلطان تک جانے کی اجازت مل گئی تو یہ اپنا کام کرے گا اور اس کے بعد لڑکی اپنا کام کرے گی۔
لڑکی کو سلطان پر اپنے حسن اور خوبصورتی کا ظلم طاری کرنا تھا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ سلطان انسان ہے۔ وہ اس کے حال میں آجائے گا، اور شراب ضرور پیتا ہو گا۔ لڑکی نے ایک انگوٹھی پہن رکھی تھی۔ اس نے انگوٹھی کا اوپر کا حصہ انگوٹھی سے الگ کر دیا اور بتایا کہ اسے یہ زہر دیا گیا تھا جو اسے سلطان پر اپنا ظلم طاری کر کے اسے شراب یا مشروب میں ڈالنا تھا۔

لڑکی نے انگوٹھی کو اٹھا لیا تو اس میں سے گھوڑا سا سفوف زمین پر گرنا۔ لڑکی نے اس پر پاؤں مار کر اسے مٹی میں ملا دیا۔ اس نے اندر کی حالت یہ بتائی کہ ایک طرف تو پنڈت بت کے آگے لیٹ لیٹ کر اور ماتھے رگڑ رگڑ کر در سے ہیں، اور دوسری طرف وہ ناچنے والیوں کو اندھیرے کمروں میں لے جا کر بدی میں مصروف ہیں۔ انہیں کہا جا رہا ہے کہ شادی عھتوں کی قربانی مانگ رہا ہے۔ لڑکی نے شہر کی کیفیت بھی بتائی اور کہا کہ ہر شہری سومات کو بچانے کے لیے اپنی جان تک قربان کرنے کو تیار ہے لیکن ان پر خوف بھی طاری ہے۔

ایجاد کئے ہوئے طریقے تھے۔
یہ بوڑھا وحشی لڑکی کو غائب کر کے سلطان محمود کی طرف یہ کہتا ہوا آہستہ آہستہ بڑھا کہ وہ سلطان کو بھی تھوڑی سی دیر کے لیے عالم اوداع میں پہنچا دے گا۔ سلطان نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور مسکرا کر اسے روک دیا۔ وہ نہ رکا تو ایک محافظ نے اسے بازو سے پکڑ کر روک لیا۔ ترجان نے اسے اس کی زبان میں کہا کہ سلطان کے اشارے کی خلاف ورزی نہ کرے۔

”اور اسے کہو کہ یہ مجھے تھوڑی سی دیر کے لیے روحوں کے دیس میں پہنچا سکتا ہے اور میں اسے اس دیس میں ہمیشہ کے لیے پہنچا سکتا ہوں۔“ سلطان محمود نے کہا۔ ”اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ سیر کی تلوار اس کی گردن کاٹ دے گی تو لڑکی خود بخود سب کو نظر آنے لگے گی۔ اسے کہو کہ لڑکی کو فوراً سیر سے سامنے لائے اور اسے کہو کہیں یہاں شہید بازی دیکھنے نہیں آیا؟“

بوڑھے ریشی نے لڑکی کی چادر دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر چھکا دیا اور اپنے بازو آگے کو بھیلادئے۔ چادر تن گئی اور لڑکی اس چادر میں سے برآمد ہوئی۔ لڑکی پر غصہ کی سی طاری تھی۔ سلطان محمود نے محافظوں سے کہا کہ اس بوڑھے کو باہر لے جائیں۔ اسے لے گئے تو سلطان نے لڑکی سے کہا کہ وہ بتا دے کہ یہ بوڑھا جادوگر کس ارادے سے یہاں آیا تھا۔ اگر وہ نہیں بتائے گی تو اسے بہت بڑی موت مرنا پڑے گا۔ ان کے درمیان ترجان موجود تھا۔

لڑکی کچھ دیر سلطان کو دیکھتی رہی۔ اس کے چہرے پر حیرت کا تاثر تھا۔ اس نے کہا۔ ”مجھے بتایا گیا تھا کہ آپ مسلمانوں کے بادشاہ ہیں.... آپ کیسے بادشاہ ہیں جو مجھے موت کے حوالے کرنا چاہتے ہیں؟.... میں وہ کھلونہ ہوں جسے کوئی بادشاہ اور کوئی مہاراجہ کسی دوسرے بادشاہ اور مہاراجہ کو نہیں دینا چاہتا۔ میں اپنی قدر و قیمت سے واقف ہوں۔“

”اور میں اس مقصد سے واقف ہوں جس کے لیے یہاں آیا ہوں۔“ سلطان محمود نے کہا۔ ”میں تم سے پوچھ رہا ہوں کہ اس شہید باز کو مہاراجہ نے بھیجا ہے یا یہ خود آیا“

”میں اس مندر کی داسی ہوں۔“ لڑکی نے کہا۔ ”ہندو مجھے اور مجھ جی لڑکیوں کو پاک اور مقدس سمجھتے ہیں مگر ہم اس مندر اور اس شہر کی حقیقت سے آگاہ ہیں۔ نہ ہم پاک ہیں نہ ہندو اور ہر دہت پاک ہیں۔ میرا کوئی مذہب نہیں۔ مجھے آپ اپنی داسی بنالیں۔ یہی میرا مذہب ہے۔“

سلطان محمود نے زیادہ باتیں نہ کیں۔ بوڑھے رشی کو اندر بلایا۔

”مجھے ہندوستان میں آئے پچیس برس گزر گئے ہیں۔“ سلطان نے بوڑھے سے کہا۔ ”کیا تم میرے پاس یہ سمجھ کر آئے ہو کہ مجھے ہندوستان کی ان شہیدہ بایلوں کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں؟ کیا میں لوگوں کی حیران کن طاقتوں سے واقف نہیں؟ میں ایک سچے مذہب کا پرستار ہوں۔ لوگ بہاراج! میں اس مذہب کا پرستار ہوں جس کی بیٹیوں کی عصمت پر ہم جانیں قربان کر دیا کرتے ہیں۔ ہم ہندوؤں، یہودیوں اور نصرانیوں کی طرح اپنی بیٹیوں کو نکاح نہیں بچایا کرتے اور انہیں دشمن کے قبضوں میں نہیں بھیجا کرتے۔“

”میں اس بحث کے لیے نہیں آیا کہ مذہب کس کا سچا ہے۔“ بوڑھے

نے ایسی باوقار آواز میں کہا جیسے وہ سلطان محمود کو جھوٹا سا آدمی سمجھتا ہو۔ ”اپنے دھن اور اپنے مذہب کی خاطر ہماری بیٹیاں اپنا آپ اور اپنی عزت قربان کر دیا کرتی ہیں۔ یہ ہمارے مذہب کا حکم ہے۔ آپ کی عمر مجھ سے بہت کم ہے سلطان! آپ اپنی بیٹیوں کی عصمتوں کی حفاظت کے لیے ہمیشہ زندہ نہیں رہیں گے۔ ہماری بیٹیاں آپ کے مردوں کو عصمتوں کے شہنائی ادا سوداگر بنانے کے لیے زندہ ہیں گی۔ میں نے آپ کی بات پوری نہیں سونے دی تھی۔ مجھے معلوم ہے آپ کی کہنا چاہتے ہیں۔ وہ میں کہہ دیتا ہوں تاکہ آپ کا وقت ضائع نہ ہو۔ یہ ہمارا فرض ہے کہ اپنی بیٹیوں کو یہ سبق دیں کہ اپنے دشمن کو کس طرح بھگا کر سکتی ہیں۔ میں آپ کو راز کی بات اس لیے بتا رہا ہوں کہ میری چال ناکام ہو گئی ہے۔ آپ میرے قتل کا حکم دے دیں۔ اس لڑکی کو بھی مار دیں یا اسے مال غنیمت سمجھ کر اپنے پاس رکھ لیں۔ میں آپ کو یہ بتا دیتا ہوں کہ ہماری لڑکیاں مسلمانوں کے مذہب اور

ایمان کو خرید لیں گی۔ بھارت ماتا میں اسلام نہیں رہے گا۔“

سلطان محمود بوڑھے کی باتیں بڑی غور سے سن رہا تھا۔ اس کے چہرے پر نہ غصے کا تاثر تھا نہ اکٹا سہٹ کا لطیف سا تبسم تھا جو اُس کے ہونٹوں کو ذرا سا خم دیتے ہوئے تھا۔

”قتل ہونے سے پہلے میں آپ کو بہاراج کنور رائے کی طرف سے ایک پیشکش کرنا چاہتا ہوں۔“ بوڑھے نے کہا۔ ”آپ جتنی دولت اور جس قدر زر و جواہرات مانگیں گے آپ کے خیمے میں پہنچا دیئے جائیں گے۔ اس عمر اور اس حسن کی آپ جتنی لڑکیاں مانگیں گے آپ کو پیش کر دی جائیں گی۔ آپ، واپس چلے جائیں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ واپسی کے دوران کوئی فوج آپ کو پریشان نہیں کرے گی۔ اگر آپ کو یہ پیشکش قبول نہیں تو میں آپ کو خبردار کر دیتا ہوں کہ کم از کم تین مہاراجوں کی فوجیں کل شام تک پہنچ جائیں گی، اور آپ پر عقب سے ایسا حملہ ہو گا کہ آپ ہندوستان کی جگی طاقت اور سوسنات کی دیواروں کے درمیان پس جائیں گے۔ آپ کا کوئی ایک بھی سپاہی واپس جا کر یہ بتانے کے لیے زندہ نہیں رہے گا کہ غزنی کی فوج کا انجام کیا ہوا ہے۔“

خیمے میں ایک محافظ کی آواز گرجی۔ ”خاموش... سب ہند“ اور اُس نے تلوار نکال لی۔

سلطان محمود نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے روک دیا اور کہا۔ ”یہ ہمارا قیدی نہیں یہاں ہے۔ اپنے بہاراج کا ایلچی ہے۔“ سلطان نے بوڑھے سے کہا۔ ”میں معافی چاہتا ہوں میرے محافظ نے آپ کو ہندوستان کا کتا کہا ہے۔“

”اگر یہ کسی بہاراج کے دربار میں ایسی گت خجی کرتا تو اسے اسی وقت قتل کر دیا جاتا۔“ بوڑھے نے کہا۔

”ہم سب اس وقت خدا کے دربار میں ہیں۔“ سلطان محمود نے کہا۔ ”خدا کے دربار میں کوئی کسی کو قتل نہیں کر سکتا۔ یہ لوگ میرے حکم سے نہیں، خدا کے حکم سے یہاں آئے ہیں۔ مجھے ان کی صرف قیادت کا فرض سونپا گیا ہے۔“

کو محاصرے کی قیادت کے لیے وہیں چھوڑا اور ولایت دی کہ ابھی حملہ نہ کیا جائے بلکہ تیاری کی حالت میں رہا جائے۔ وہ دشمن کی چال سمجھ گیا تھا۔ اُس نے سالار اعلیٰ سے کہا۔ ”یہ تجھے سے ہم پر حملہ ہوتے ہی شہر کے دروازے کھلیں گے اور اندر کی فوج باہر آکر ہم پر حملہ کرنے گی۔ پہلوؤں کو پھیلا دو۔ دشمن جب آگے آجائے تو پہلوؤں سے نکل کر شہر میں داخل ہونے کی کوشش کرنا۔“

یہ تجھ سے آئی والی ایک فوج راجہ پریم دیو کی تھی جسے بعض مورخوں نے برہم دیو لکھا ہے اور دوسری فوج راجہ دیو آسرم کی تھی۔ سلطان محمود نے جو دستے عقب کا حصار رکھنے کے لیے بھیجے رکھے تھے، ان کا کمانڈر سالار ابو الحسن تھا۔ سلطان گھوڑا سرپٹ دوڑاتا وہاں پہنچا۔ صورت حال مخدوش تھی۔ اُس نے جاتے ہی تیزی سے صورت حال کا جائزہ لیا اور حکم دیا کہ آگے سامنے کی ٹکر نہ لی جائے۔ دونوں پہلوؤں سے حملہ کر دیا جائے۔ سلطان خود ایک بلند جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ گھوڑے دوڑ پڑے اور اللہ اکبر کے نعروں سے زمین و آسمان ہلنے لگے۔

ادھر شہر کے دونوں دروازے کھلے اور سومات کی فوج بہت تیزی سے باہر آئی اور کھیل کر بڑی خطرناک ترتیب میں ہو کے محاصرے پر حملہ آور ہوئی۔ اب غزنی کی فوج محاصرے میں تھی۔ گھوڑی ہی دیر بعد سلطان محمود کے چہرے پر پریشانی نظر آنے لگی۔ دونوں راجوں کی فوجیں پہلوؤں پر حملے کو روکنے کے لیے تیار تھیں۔ انہوں نے فوراً اپنی ترتیب بدل لی۔

پر لڑائی نہیں تھرتھا۔ بڑی تیز لڑائی تھی اور بڑی تیزی سے دونوں فریقوں کی نفری کٹ کٹ کر گر رہی تھی۔ ادھر سالار اعلیٰ ابو عبد اللہ بڑی کامیابی سے سومات کی فوج کو روکے ہوئے تھا مگر ہندو زندگی اور موت کا سحر کر رہے تھے۔ آدھ دن گذر گیا۔ مورخ لکھتے ہیں کہ غزنی والوں کو اپنی شکست صاف نظر آنے لگی تھی۔ اس جنگ پر دو مستند کتابوں کا ملاتُ التاریخ ”اور تاریخ کئی“ میں لکھا ہے کہ راجوں کی فوج کو تنازعہ دم تک مل رہی تھی۔ محمد قاسم فرشتہ لکھتا ہے: ”سلطان محمود نے جب دیکھا کہ اس کی کوئی چال کامیاب نہیں ہو رہی تو وہ گھوڑے

میں ان کے جذبات، ان کے غصے اور ان کے قہقروں کو زنجیریں نہیں ڈال سکتا“ سلطان بولتے بولتے اٹھ کھڑا ہوا اور اُس نے محافظ سے کہا۔ ”اس بزرگ کو اور اس لڑکی کو اپنی حفاظت میں عزت سے قلعے کے دروازے تک چھوڑ دو۔“ اُس نے پورے سے کہا۔ ”اپنے مہاراجہ سے کہنا کہ تم سومات کو ایک پورے لوگوں، ایک آبرو باختہ زمین لڑکی اور دراز سے زہر کے ذریعے نہیں بچا سکتے۔ ہم یہاں سے زندہ نکل جانے کی خواہش لے کر نہیں آئے۔ جیسے لوگ مہاراجہ! اس لڑکی کو ساتھ لے جائے۔“

بوڑھا ریشی سلطان کو کچھ دیر دیکھتا رہا، پھر وہ بے اختیار ہو کر آگے بڑھا اور سلطان کا وایاں لکھتا اپنے ماتھے میں لے کر جُڑا اور بولا۔ ”مجھے صاف نظر آئے لگا ہے کہ فوج سلطان کی ہوگی۔“ اور وہ لڑکی کو ساتھ لے کر محافظ کے ساتھ پیچھے سے نکل گیا۔

*

اگر سومات کی جنگ کا حال لمبہ لمحہ لکھا جائے تو ایک ہزار صفحات کی کتاب بن جائے۔ ہندوؤں نے غزنی کی فوج اور سلطان محمود کو ذہنی طور پر میکا کر کرنے کیلئے زمین و فوج کے استعمال کے تھے۔ فوج کی نفری نے افراد کی طور پر جس شجاعت اور فرض شناسی کے مظاہرے کئے وہ بڑی لمبی داستان ہے۔ اس جنگ کا شاندار رخ کی چند ایک مشہور جگہوں میں ہوتا ہے۔ تاریخ اسلام کا تو یہ بہت بڑا سحر کر چکا ہے۔ ہندو مورخوں نے دو چار صفحات میں بیان کر کے اس کی اہمیت پر پردہ ڈال دیا ہے۔ اُس رات۔ جس رات بوڑھا ریشی سلطان کے پاس آیا تھا، ایسی صبح کو جنم دیا جو ہندوستان اور غزنی کی تاریخوں میں اور خصوصاً اسلام کی تاریخ میں کبھی فراموش نہیں کی جائے گی۔ سلطان محمود شہر کی دیواروں اور دروازوں پر نئے انداز سے حملہ کرنے کے احکام دے رہا تھا۔ اسے اطلاع ملی کہ عقب میں دشمن کی دو فوجیں نیم دائرے میں آگئی ہیں اور وہ غزنی کی فوج کو گھیرے میں لے رہی ہیں۔ سلطان نے اس صورت حال سے نمٹنے کا بندوبست کر رکھا تھا مگر وہ حیران رہ گیا کہ یہ فوجیں اپنی خاصوشی سے کس طرح آگئی ہیں۔ اُس نے سالار اعلیٰ ابو عبد اللہ

اُس پر حملہ کرے۔

جب یہ سمجھ گئی تو ہندوؤں کو بہت جلا کہ اُن کی مدد کے لیے جو فوجیں آئی تھیں وہ ختم ہو چکی ہیں اور وہ اب گھیرے میں آگئے ہیں۔ وہ دفاعی لڑائی لڑنے لگے اور یہ بھی نکل کر شہر کے اندر جانے کی کوشش کرنے لگے مگر وہ نکل نہ سکے۔ غزنی کا ایک جیش جو دروازے اور دیواریں توڑنے کے لیے تربیت یافتہ تھا، دروازے توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔

دیواروں کے اوپر جو ہندو کھڑے تھے، انہوں نے شہر میں خبر پھیلادی کہ اُن کی فوج کٹ گئی ہے۔ یہ خبر بالکل صحیح تھی۔ ابن الاثر اور ابن خلیفہ لکھتے ہیں کہ ہندو سپاہی مذہبی جنوں سے لڑ رہے تھے لیکن جو مذہبی جذبہ مسلمانوں میں تھا اور جو قیادت مسلمانوں کی تھی، اس کے آگے ہندوؤں کا مذہبی جنون ختم ہو گیا اور وہ جانیں بچانے کے لیے ماتھے پاؤں مارنے لگے۔ شہر میں خبر پھیلی تو بہت سے ہندو فوجی بچے دو دروازے سے جو سمندر میں کھلتا تھا، باہر نکلے۔ دہاں سینکڑوں کشتیاں موجود تھیں۔

اس کی اطلاع سلطان کو مل گئی۔ اُس نے حکم دیا کہ ادھر کے دستے کشتیوں پر قبضہ کر کے ادھر والے دروازے سے اندر جائیں۔ اس دستے نے فوراً دہاں پہنچ کر بہت سی کشتیوں پر قبضہ کر لیا اور بھگتے ہوئے ہندو فوجیوں پر شیر برساتے ہوئے کشتیوں میں دروازے تک پہنچ گئے۔ دروازہ کھلا تھا۔ دہاں کوئی مزاحمت نہیں تھی۔

ادھر دروازے کھول لیے گئے۔ بغضِ مورخ کہتے ہیں کہ ہندوؤں نے دروازے خود کھولے تھے۔ اُن کا مقصد غالباً یہ تھا کہ غزنی کی فوج کو شہر کی گلیوں کی بھول بھلیوں میں لڑایا جائے۔ غزنی کی فوج شہر میں داخل ہو گئی۔ شہریوں نے مقابلہ کرنے کی کوشش کی۔ وہ گردہ در گردہ مقابلے کے لیے آئے اور کٹ کٹ کر گرے۔ انہوں نے جھوٹے شیر برساتے۔ ہندو عورتوں نے اوپر سے پتھر مارے جو انہوں نے اسی مقصد کے لیے گھروں میں جمع کر رکھے تھے۔ غزنی والوں نے چند ایک مکانوں کو آگ لگا دی۔ اس کے ساتھ ہی شہر میں یہ خبر پھیل گئی کہ سومات کی

سے کو در اثر اور تیلہ رو ہو کر دھن پڑھے، پھر دعا مانگی۔ وہ اکثر معرکوں کے دوران ایسے ہی کیا کرتا تھا اور نہ صرف اُس میں بلکہ ہر کی فوج میں نیا جوش اور تازگی پیدا ہو جاتی تھی۔۔۔۔۔ سالار ابواکسن اس کے قریب کھڑا تھا۔ سلطان نے ابواکسن کا ماتھے پر ہاتھ اور کہا۔ 'ابواکسن! فتح ہماری ہے'۔ اُس نے سالار کو گھوڑے پر سوار ہونے کو کہا، خود بھی سوار ہوا۔ اُس نے اپنا جھنڈا اونچا کرنے کو کہا اور سپاہیوں کی طرح میدانِ جنگ میں شامل ہو گیا۔ ہر طرف اعلان ہونے لگے۔ سلطان لڑ رہے ہیں۔۔۔۔۔ غزنی کے مجاہدو! سلطان تمہارے ساتھ ہے۔

اس کا فوج پر دمی اثر ہوا جو اس سے پہلے کئی معرکوں میں دیکھنے میں آیا تھا۔ پروفیسر محمد حبیب نے کچھ مؤرخوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب سلطان محمود خود لڑائی میں شریک ہوا اُس وقت اُس کے ماتھے میں اپنے مژدہ شیش ابواکسن فرمائی کا جھنڈا تھا جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا اور اسے اُس نے عقیدت کے طور پر اپنے گھوڑے کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔

فرشتے کے مطابق سلطان کا یہ عمل اتنا دہشت ناک تھا کہ دلوں راجوں کی فوجوں کا رابطہ ٹوٹ گیا، پھر ان کی مرکزیت ٹوٹی۔ غزنی کے چند ایک جانبازوں نے دونوں دلوں کے قلوب پر حملہ کر کے اُن کے جھنڈے گرادیے اور راجے میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اس کے بعد راجوں کی فوج کا قتل عام شروع ہو گیا۔ فرشتہ نے لکھا ہے کہ کھوڑی سی دیر میں کم و بیش پانچ ہزار ہندو فوجیوں کی لاشیں غزنی کے گھوڑوں کے دموں میں پھیل جاتیں تھیں۔ راجوں کے بچے کچے کچے سپاہی بھاگے لیکن غزنی کے گھوڑا سواروں نے انہیں بھاگنے نہ دیا۔

✱

سلطان محمود کو سومات کی فوج اور اپنے سالار اعلیٰ ابو عبد اللہ کے معرکے کی رپورٹیں ملیں۔ اُس نے سالار اعلیٰ کو پیغام بھیجا کہ لڑتے لڑتے پیچھے ہٹنے کی کوشش کرو۔ سالار اعلیٰ نے اس حکم پر عمل کیا تو سومات کی فوج آگے آگئی۔ شہر کے دروازے بند تھے۔ سلطان محمود نے سالار ابواکسن سے کہا کہ وہ سومات کی فوج کے پیچھے

بعض مورخوں نے لکھا ہے کہ دو سال اردن نے اور سلطان کے اپنے بیٹے مسعود نے جو اس کے ساتھ تھا، سلطان سے کہا کہ ان کی پیش کش مان لی جائے (سلطان محمود کے تین بیٹے، عبدالرشید مسعود اور محمد اس کے ساتھ آئے تھے)۔ سلطان محمود نے مسکرا کر اور ٹھکے ٹھکے سے لہجے میں کہا کہ تم لوگ میری عاقبت خراب کرنا چاہتے ہو؟ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ رزق قیامت اللہ تعالیٰ یوں بیکارے کو کہاں سے وہ محمود جس نے سب سے بڑا ثبوت توڑا تھا۔ میں دُرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ یوں نہ کہیں کہ لاؤ ہمارے سامنے غزنی کے محمود جس نے زروجاہرات کے عوض ثبوت پرستوں کو ثبوت بخش دیا تھا۔ کیا یہ میرے لیے بہتر نہیں کہ تاریخ مجھے ثبوت فروش نہ کہے ثبوت شکن کہے؟

سلطان نے حکم دیا۔ اس ثبوت کے دو کمرے غزنی جاتیں گے۔ ایک ہیرے گھر کے باہر دروازے میں رکھا جائے گا اور دوسرا غزنی کی جامع مسجد کے دروازے کے باہر جہاں یہ ہر کسی کے پاؤں تلے آئے۔ اس کا ایک ٹکڑا مدینہ منورہ اور دوسرا مکہ معظمہ بھیج دیا جائے۔

فرشتہ نے اور بہت سے دوسرے مورخوں نے لکھا ہے کہ آج بھی اس ثبوت کا ایک ایک ٹکڑا غزنی میں سلطان کے محل کے بیرونی دروازے میں، دوسرا جامع مسجد کے دروازے میں، آئینہ مدینہ منورہ اور چوتھا مکہ معظمہ میں موجود ہے۔

مندر کی عمارت ساگوان کے ہاں سکونوں پر کھڑی تھی۔ سلطان نے شہر دیو کا ثبوت تڑا کر باہر پھینک دیا اور مندر سے تمام خزانہ نکال کر ستونوں کو آگ لگا دی۔ تھوڑی دیر بعد ہندوستان کا سب سے بڑا ثبوت خاندان جس میں "چاند کے آقا" کا ثبوت تھا اور جو مرے ہوئے انسانوں کو دوسرا جنم دیتا تھا "ہدیت ناک گرگراٹھ" سے ملے کا ڈھیر بن گیا۔ غزنی کی فوج نے طبع مندر میں پھینک دیا۔ نیچے مندر کی صرف بنیادیں رہ گئیں۔ تمام مورخوں نے لکھا ہے کہ ہندوؤں کا یہ الزام غلط اور بے بنیاد ہے کہ سومات کا ثبوت اندر سے کھوکھلا تھا اور ہیرے جواہرات سے بھرا ہوا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کوئی باقاعدہ تراشاہ ثبوت نہیں تھا۔ یہ ایک چٹان کا لمبوتر ٹکڑا تھا جس کے

فوج ایک طرف تو کٹ گئی ہے اور جو اندر تھی وہ پھیلے دروازے سے سمندر کے راستے بھاگ گئی ہے۔ اس سے شہریوں کے حوصلے ٹوٹ گئے اور سومات کی جنگ ختم ہو گئی۔

اس جنگ میں سومات کے چوتھری، بابا ہر سے آئے ہوئے زائرین اور جو ہندو فوجی مارے گئے تھے ان کی تعداد پچاس ہزار تھی۔ سمندر کے راستے جو فوجی بھاگے تھے، ان کی تعداد چار ہزار تھی لیکن یہ سب بھاگ نہ سکے۔ ان میں سے بہت سے غزنی والوں کے تیزوں کا نشانہ بن گئے تھے کچھ سمندر میں کودے اور ڈوب کر مر گئے۔ چند ایک کشتیاں الٹ بھٹی گئی تھیں۔

سومات کا مندر سلطان محمود کے قدموں میں پڑا تھا۔ یہ ۹ جنوری ۱۰۲۹ء (۱۶ ذی القعدہ ۴۱۷ھ) کا دن تھا۔

✱

سلطان محمود نے جب مندر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ یہ فریق تعمیر کا شاہکار تھا مندر کی سیڑھیوں پر بند توں کا جو کم کھڑا تھا۔ سب نے ہاتھ جوڑے ہوئے تھے۔ ان کے چہروں پر خوف تھا۔ سلطان محمود کے متعلق تاریخوں میں آیا ہے کہ وہ بند توں اور بکریوں کو نہ قید کرتا تھا نہ انہیں کوئی اور منرا مہیٹا تھا۔ اس نے سومات کے بند توں کو ہاتھ جوڑے اپنے سامنے کھڑے دیکھا تو حکم دیا کہ انہیں کہو ہاتھ نیچے کر لیں، میں سومات کا ثبوت نہیں ہوں، اور انہیں کہہ دو کہ انہیں کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔ سلطان سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔ یہ فرج اسے بہت لمبی پڑی تھی اس نے اپنے ایک محافظ سے حکمی کھار لیا اور اس چوڑے پر چڑھ کر جس پر شہر دیو کا ثبوت کھڑا تھا، کھارے سے ثبوت کی ناک توڑ دی اور حکم دیا کہ اس ثبوت کو توڑ دیا جائے۔ بڑا ثبوت اور چند دوسرے بند ثبوت سلطان کے قدموں میں گر پڑے اور التجا کی کہ وہ سلطان کو سومات کی تمام دولت دے دیں گے وہ ثبوت نہ توڑے اور مندر کو اسی طرح کھڑا رہنے دے۔ سلطان نے انہیں کہا کہ وہ اتنی دُور سے یہاں غزنی کی ہزاروں ماہوں کے بیٹے مروانے کے لیے نہیں آیا تھا۔

پرتھوی سے حملہ کیا تھا، وہ راجہ پریم دیو نے کرایا تھا۔ اس حملے میں غزنی کے تین ہزار سپاہی مارے گئے تھے۔ سلطان کو بتایا گیا کہ پریم دیو سومات کے شمال میں ایک سو بیس میل دور گندادی کے مقام پر ہے اور یہ مقام چاروں طرف سے سمندر میں گھرا ہوا ہے۔

سلطان محمود اس قدر غصے میں تھا کہ اس نے گندادی کی طرف پیش قدمی کا حکم دے دیا۔ جب سلطان دہلی پہنچا تو اس نے دیکھا کہ تلے تک پہنچا ممکن نہیں کیونکہ چاروں طرف سمندر تھا۔ ایک طرف پانی کم تھا۔ یہ بھی پتہ چلا کہ پریم دیو نے اپنے آپ کو تلے میں بند کر رکھا ہے۔ محمد قاسم فرستہ لکھا ہے کہ ایک رات سلطان محمود نے قرآن کی تلاوت کی کچھ خاص آیات پڑھیں اور ذکر خدا سے راہنمائی اور مدد کی دعا کی۔ اگلی صبح اس نے دیکھا کہ سمندر کا پانی پیچھے چلا گیا ہے۔ چاروں طرف سے پانی کم ہوا تھا وہاں دلدل بھی۔ سلطان نے دلدل میں سی گھوڑے ڈال دیئے اور تلے تک جا پہنچا۔

غزنی کی فوج نے تلے پر حملہ کیا اور تھوڑی ہی دیر میں تلے کا دواڑہ کھل گیا۔ پتہ چلا کہ راجہ پریم دیو سمندر کے راستے نکل بھاگا ہے۔ اس کی فوج سومات کے میدان میں مسلمانوں سے شکست کھا کر آئی تھی۔ اس نے ہتھیار ڈال دیئے۔ سلطان محمود نے حکم دیا کہ گندادی کو اجاڑ دیا جائے۔

سلطان محمود کچھ دن دیہی بٹھرا۔ یہ گجرات کا علاقہ تھا جس کی آب و ہوا سلطان کو اتنی اچھی لگی کہ اس نے گجرات میں سلطنت غزنی کا دار الحکومت بنانے کا فیصلہ کر لیا اور اپنے بیٹے مسعود سے کہا کہ وہ غزنی چلا جائے اور وہاں کی سلطنت سنبھال لے۔

”کیا سبجی اور خراسانی یہ نہیں کہیں گے کہ سلطان محمود میدان چھوڑ کر بھاگ گیا ہے؟“ مسعود نے کہا۔ ”ہم نے خراسان کا علاقہ بڑے جوان مردا کر فتح کیا تھا۔“

”آپ یہاں کسی مقامی راجہ کو اپنا امیر مقرر کر دیں۔“ ایک مشیر نے کہا۔

”غزنی ایسا مرکز ہے جو آپ کی غیر حاضری میں اپنی مرکزیت اور اہمیت کھو بیٹھے گا۔“ سلطان محمود مان گیا۔ وہ سومات والیں چلا گیا اور بہت سوچ بچار کے بعد راجہ دیو اسرم کو سومات کا گورنر مقرر کر دیا اور غزنی واپس جانے کی تیاری کر کے لگا۔ اس نے دیو اسرم سے کہا کہ وہ اب قتان کے راستے واپس نہیں جانا چاہتا

خود خال التانوں جیسے تھے اور اسے مرد کے جنسی جذبے کی غلاست سمجھا جاتا تھا۔ ہندو مذہب غزنی کی بنیادوں پر کھڑا ہے۔

سومات کا بہار راجہ کنور رائے لاپتہ تھا۔ سلطان محمود نے وہاں سے جو رنچو ہرا سیٹے ان کی مالیت آج کے اربوں روپوں جتنی تھی۔

جب سمندر کے اندر آگ لگی ہوئی تھی، سلطان محمود شہر کی دیوار پر کھڑا دیکھ رہا تھا۔ شہر میں کہیں کہیں سے جلتے ہوئے مکانوں کا دھواں اُٹھ رہا تھا۔ لوگ شہر خالی کر رہے تھے۔ سلطان نے باہر دیکھا۔ منظر ہولناک تھا۔ زمین دور دور تک لال تھی اور لاشوں پر لاشیں بڑی تھیں۔ زخمی اسٹھنے اور چلنے کی کوشش کر رہے تھے بعض اسٹھتے تھے اور گر پڑتے تھے۔ وہ ہندو تھے۔ انہیں اُٹھانے والا کوئی نہ تھا، کوئی پانی پلانے والا نہ تھا۔ شہر کے لوگ دروازوں سے نکل کر جا رہے تھے۔ وہ اپنے زخمیوں کو دیکھا بھی گواہ نہیں کرتے تھے۔

غزنی کے سپاہی اپنے ساتھیوں کی لاشیں اُٹھا رہے تھے اور زخموں کو بھی اٹھا اٹھا کر لے جا رہے تھے۔ سلطان محمود کی نظر میدان جنگ میں گھوم رہی تھیں اور اس پر سنجیدگی طاری تھی۔ کوئی نہیں بتا سکتا کہ وہ کیا سوچ رہا تھا۔ اس نے تلے کے سامنے والے دونوں دروازوں کو دیکھا۔ اُسے شہر سے جانے والے ہندوؤں میں عورتیں اور بچے نظر آئے۔ اس نے اپنے ساتھ کھڑے کسی آدمی سے کہا کہ نیچے جا کر شہر کے لوگوں سے کہو کہ وہ ہمارے ڈر سے اپنے گھر دہلی سے نہ بھاگیں۔ انہیں غزنی کی فوج کی طرف سے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔

”کیا یہ لوگ اب بھی نہیں سمجھیں گے کہ فوج اور شکست ازمنگ اور موت پتھر کے ایک بکڑے کے ہاتھ میں نہیں اُٹھانے کا ہتھیار ہے؟“ سلطان محمود نے کہا۔ اُسے کوئی جواب نہ ملا۔

*

سلطان محمود کے حکم کے جاسوسی نے وہاں کے چند ایک مقامی آدمیوں کو اپنے حکمے میں شامل کر لیا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ جن راجوں کی فوجوں نے غزنی کی فوج

گئے اور گھوڑوں میں چلنے کی سکت نہ رہی تو سلطان محمود نے اپنے سالاروں ابو عبد اللہ محمد الطائی اور ابوالحسن سے کہا کہ اسے کچھ شک ہو رہا ہے۔ دونوں گائیڈوں کو بلاؤ۔

گائیڈ آئے تو وہ اچھی طرح چلنے کے قابل نہیں تھے۔ ان کے سر ڈول رہے تھے۔

”کیا تم پیاس سے مر نہیں رہے؟“ سلطان محمود نے ان سے پوچھا۔

”مر رہے ہیں سلطان اب!“ ایک گائیڈ نے جواب دیا۔

”تم کہتے تھے کہ اس صحرا میں پانی کی افراط ہے“ سلطان محمود نے کہا۔

”ہاں سلطان! اس صحرا میں پانی کی کمی نہیں!“

”کہاں ہے پانی؟“

”جہاں تک آپ زعمہ نہیں پہنچ سکیں گے“ گائیڈ نے جواب دیا۔

”کیا تم والہ اللہ ہمیں پانی سے دور لے آئے ہو؟“

”والہ اللہ“ گائیڈ نے کہا۔ ”ہم اپنا کام کر چکے ہیں۔“

”کیا تم ہمیں گمراہ کرنے کے لیے ساتھ آئے تھے؟“ سلطان نے سختی سے پوچھا۔

”کیا تم جانتے نہیں تھے کہ تم قتل ہو جاؤ گے؟“

”سب کچھ جانتے تھے سلطان اب“ گائیڈ نے کہا۔ ”ہم اپنی جائیں شو دیو

کے حوالے کر کے سومات سے آپ کے ساتھ چلے تھے۔ آپ کو یاد نہیں جب

راجہ دیو آسم راج کو راستہ سمجھا رہا تھا تو اس کی رانی نے کہا تھا کہ وہ آپ کو رہا کر دے گی جو آپ کو اس راستے سے لے جائیں گے جہاں پانی کی کوئی کمی نہیں

اُس نے ہمیں بتایا تھا کہ اُس نے آپ سے یہ وعدہ کیا ہے۔

وہ آپ کو دھوکہ نہیں دینا چاہتی تھی سلطان! جب آپ سومات کو تباہ و برباد کر رہے تھے

اُس وقت ہم دونوں یہاں نہیں تھے۔ ہم آئے تو تباہی مکمل ہو چکی تھی۔ ہم آتی راتیں

سو بھی نہ سکے۔ ہم نے بہت ترکیبیں سوچیں کہ آپ کو قتل کیا جائے مگر کوئی صورت

نظر نہیں آئی۔ ہمیں پتہ چلا کہ آپ کو راہنماؤں کی ضرورت ہے تو ہم دونوں نے

ادھمکی اور راستے سے اُسے واقفیت نہیں۔ دیو آسم نے سلطان کو وہ راستہ بتایا جو دن کچھ میں سے گذر کر بلوچستان کو جاتا تھا۔ بلوچستان سے سلطان آسانی سے غزنی پہنچ سکتا تھا۔

”ہم سلطان کو ایسے آدمی دیں گے جو اُن کی راہنمائی کریں گے۔“ راجہ دیو آسم کی رانی بھی موجود تھی۔ کہنے لگی۔ ”رن کچھ اور اس سے آگے کے صحرائیں پانی اُن ہی لوگوں کو مل سکتا ہے جو اس محل سے واقف ہیں۔“

*

غزنی کی فوج فاتحانہ انداز سے واپس جا رہی تھی۔ اس کی لغری اب خاصی کم

تھی۔ لاشیں سومات کے ایک میدان میں دفن کر دی گئی تھیں۔ زخمی ساتھ تھے

ادبے شمار اونٹ اُس خزانے سے لے رہے تھے جو اس جنگ کا مال غنیمت

تھا۔ اب فوج اللہ اکبر کے نعرے نہیں لگا رہی تھی، سپاہی مل کر جنگی ترانے گاتے

جا رہے تھے۔ وہ سومات کو جاتے ہوئے بھی صحرائے گذرے تھے۔ اس ظالم

صحرے کو وہ ساری عمر نہیں بھولے ہوں گے۔ اب بھی اُن کے سامنے دیواری اجنبی

ادبے رحم تھا مگر اب ان کے تاثرات اور جذبات کی کیفیت ایسی تھی جیسے

اُن کی پیاس ہمیشہ کے لیے کچھ گئی ہو۔ ان کی رو میں منج سے سرشار اور تر و تازہ تھیں۔

فوج صحرائیں داخل ہو گئی۔ پھر تین چار دن گذر گئے۔ پانی کا کہیں نشان نظر

نہ آیا۔ گھوڑوں کو پانی پلانا تھا۔ انسان اپنے لیے جو پانی ساتھ لائے تھے وہ ختم ہو

چکا تھا۔ اب سلطان محمود نے ایسا حکم نہیں دیا تھا کہ شیکڑے پانی سے بھر کر اونٹوں

پر لاد لیے جائیں کیونکہ گائیڈوں نے اُسے یقین دلایا تھا کہ وہ اُسے ایسے راستے

سے لے جائیں گے جہاں پانی کی بہتات ہے۔ اب گائیڈوں سے پوچھا گیا کہ

پانی کہاں ہے تو وہ کہتے رہے کہ آگے ہے۔ اس طرح انہوں نے ایک دن اور

گذاردیا۔ اگلے دن جب فوج میں بے چینی پھیل گئی، سپاہی پیاس سے نڈھال ہو

اپنے آپ کو پیش کیا۔ ہم اس صحرا سے واقف ہیں۔ ہم خوش ہوئے کہ صرف آپ سے نہیں، غزنی کی پوری فوج سے انتقام لیں گے۔ ہم آپ کو پانی سے بہت دودے آئے ہیں ہم کل مر جائیں گے۔ ہم نے شہر دیو کی توہین کا انتقام لے لیا ہے۔ اب ہمیں زندہ رہنے کی خواہش نہیں۔ اگر آپ ہمیں قتل کر دیں گے تو یہ آپ کا ہم پر کرم ہو گا۔ ہم پیاس کی اذیت سے بچ جائیں گے، سلطان نے حکم دیا کہ انہیں قتل کر دیا جائے۔

*

فوج کی حالت ویسی ہی ہو رہی تھی جیسی ان دو گائیڈوں کی تھی۔ گائیڈوں نے غلط نہیں کہا تھا کہ وہ کل تک مر جائیں گے۔ انہوں نے بڑا ہی خوفناک انتقام لیا تھا۔ سومنات کا شہر دیو سچا معلوم ہوتا تھا۔ اُسی رات (محمد قاسم فرشتہ، فرخی اور مجموعہ الانصاب کے مطابق) سلطان محمود نے عشاء کی نماز کے بعد خیمے سے باہر چند نوافل پڑھے۔ اُس کی فوج کے گھوڑے پیاس سے ہنہار رہے تھے۔ کچھ پیاسی کراہ بھی رہے تھے۔ صحرا کی بے جھمی انتہا کو پہنچ رہی تھی۔ سلطان کو نوافل کے دوران جانوروں اور انسانوں کی پیاسی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ سلطان ان آوازوں کو سمجھتا تھا اور یہ بھی سمجھتا تھا کہ اُس کی فوج میں سے بیشتر پیاسی کل رات اُس کے ساتھ نہیں ہوں گے۔ ظالم رگزار اُن کے جبوں سے نمی کا آخری قطرہ بھی چوس لے گا۔

سلطان نے دُعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور وہ ایسا رو دیا کہ اُس کی زبان سے کوئی لفظ نہ نکلا۔ خدا جانتا ہے اُس کے بندوں کے دلوں میں کیا ہے اور جلد یہ بھی جانتا تھا کہ یہ فوج اُس کے نام کے نمبر لگا کر باطل پر لڑتی تھی۔ آسمان میں ایک ستارہ ٹوٹا جو شہابِ ثاقب تھا۔ ایک شعلہ ایک سمت کو اُٹا اور صحرا کے تاریک افق پر دھو بھوس ہو گیا۔ فرشتہ نے اسے ایک پُر اسرار روشنی لکھا ہے لیکن دوسرے مورخوں نے اسے شہابِ ثاقب کہا ہے جو زیادہ صحیح ہے۔ سلطان محمود کے دل سے آواز اُٹھی کہ جدھر شہابِ ثاقب گیا ہے، اُسے اُسی

سمت جانا چاہیے۔ اسے وہ خدا کا اشارہ سمجھا اور اُس نے اُٹھ کر سبائیک بلند علا کیلے۔ خدا نے اشارہ دے دیا ہے۔ کل ہم انشاء اللہ بانی پر سہولے گے۔ انہی تاریخ نویسوں نے لکھا ہے کہ اس صحرا میں کبھی پرندہ نظر نہیں آیا تھا۔ یہ رات گذری اور صبح طلوع ہوئی تو سلطان محمود کو اُدھر فضا میں پرندوں کی آوازیں سنائی دیں۔ اُس نے اُدھر دیکھا اور بے اختیار بولا۔ ”یہ بانی کے پرندے ہیں۔“ وہ اس غول کو دیکھتا رہا۔ غول دُور جا کر نیچے چلا گیا۔ یہ وہی سمت تھی جدھر رات کو شہابِ ثاقب گیا تھا۔ سلطان نے اُس سمت کو ترجیح کا حکم دے دیا۔

دوسرے کچھ دیر بعد جب فوج کا دم خم ٹوٹ چکا تھا اور کسی پیاسی ہڈیاتی حالت میں مبتلا ہو گئے تھے، بانی نظر آ گیا۔ یہ تھوڑا سا پانی نہیں تھا بلکہ وسیع جھیل تھی۔ گھوڑے پانی کی مُشک پا کر بے قابو ہو گئے اور دوڑ پڑے۔ انسان بھی بے قابو ہو گئے اور پانی پی کر وہ تازہ دم ہو گئے۔

*

ابھی ان کی آزمائش باقی تھی۔ فوج گائیڈ کے بغیر جاری تھی۔ اب رات کو ستارے اُس کی راہنمائی کرتے تھے اور دن کو سورج۔ سورجوں میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ سلطان محمود نے کون سا ستارہ اختیار کیا تھا۔ اکثر سچ ند اور امر کوٹ کا نام لیتے ہیں لیکن یہ سب سے بڑا کھانا ہے کہ غزنی کی فوج کا واپسی کا سفر بڑا ہی اذیت ناک اور غیر لفظی تھا۔ بہت آگے جا کر ایک مقامی آدمی کو گائیڈ کے طور پر ساتھ لے لیا گیا۔ وہ فوج کو دیہاتے سندھ کے کنارے لے گیا۔ وہاں دریا کا پانی بہت چوڑا تھا۔ گائیڈ فوج کو دریا کے ساتھ ساتھ کھسی اور سمت لے گیا اور رات آگئی۔ پڑاؤ کیا گیا۔ آدھی رات کے وقت فوج میں بھگڑ مچ گئی۔ اس کے ساتھ عجیب سی چیخ و آوازیں سنائی دینے لگیں۔ گھوڑے دوڑ رہے تھے۔ سلطان نے گائیڈ کو بلایا مگر گائیڈ لاپتہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد پتہ چل گیا کہ کیمپ کے ایک حصے پر حملہ ہو گیا ہے۔ حملہ آوروں کے کچھ آدمی گرا لیے گئے تھے۔ اُن سے پتہ چلا کہ یہ علاقہ ہندو جاٹوں کا

ہندو کسی سلطان پر ملحقہ اٹھائے تو اسے سزائے موت دی جائے۔

ایک روایت یہ ہے کہ سلطان محمود نے دیو آسرم کو نہیں بلکہ ایک مسلمان کو جس کا نام میٹھا خان تھا، گورنر مقرر کیا تھا۔ اس روایت کا خالق ایک انگریز مصنف میجر وائسن ہے۔ یہ صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ میٹھا خان پنجابی نام ہے۔ یہ نام غزنی کا مسطور نہیں ہوتا۔

دکھپ کمانی یہ ہے کہ سومنات کی تباہی کے بعد جب سلطان محمود غزنی چلا گیا تو تھوڑا ہی عرصہ بعد سومنات سے دور ایک پنڈت مشہور ہو گیا۔ اُس نے اعلان کیا تھا کہ سلطان محمود نے شیو دیو کا بُت توڑا نہیں بلکہ اسے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ پنڈت نے لوگوں سے کہا کہ سلطان محمود بُت کو راستے میں کہیں زمین میں دفن کر گیا تھا۔ پنڈت کو خواب میں شیو دیو نے بتایا ہے کہ اپنی گائے کے بچہ کے کونٹاں علاقے میں کھلا چھوڑ دو۔ وہ جہاں ٹک کر زمین پر کھڑا رہے وہاں سے زمین کھودو۔ وہاں شیو دیو کا بُت دفن ہوگا۔ اُسے نکالو اور سومنات کے کھنڈروں میں وہیں جا کے رکھو جہاں سے اسے اٹھایا گیا تھا۔

پنڈت نے لوگوں کو ایک روز اکٹھا کر لیا اور اپنے بچہ کے کو ایک کھلے علاقے میں جاکر چھوڑ دیا۔ بچہ ڈاؤن پڑا اور ایک جگہ ٹک کر زمین پر کھڑا رہنے لگا۔ پنڈت نے لوگوں سے کہا کہ یہاں سے کھودو۔ لوگوں نے کھدائی کی تو وہاں سے شیو دیو کا بُت نکلا۔ میدھے سادے لوگوں نے شیو دیو کی جے کے نعرے لگائے اور وہیں بُت کی پوجا شروع کر دی۔ پنڈت امداراج بن گیا۔

لوگوں نے فیصلہ کیا کہ بُت کو اٹھا کر سومنات کے مندر میں رکھا جائے۔ چنانچہ بُت کو بڑی مشکل سے اٹھا کر سومنات لے جایا گیا۔ سومنات کے پنڈتوں کے سامنے بُت توڑا گیا تھا۔ انہوں نے بُت کو دیکھا تو اس پنڈت کو کچھ کر دیا تو آسرم کے سامنے لے گئے۔ پنڈت نے تسلیم کر لیا کہ اُس نے کوئی ایک مہینہ صرف کر کے اپنے بچہ کے کوسدھایا تھا کہ اس جگہ پہنچ کر کھڑا رہے۔ یہ بُت اُس نے وہ آدمیوں کو ساتھ لاکر تیار کیا تھا۔ اس بُت کو سمندر میں پھینک دیا گیا۔

بے وجہ جو میں اور لوٹ مار بھی کرتے ہیں اور ان کی باقاعدہ ریاست ہے۔ وہ خاصا نقصان کر گئے تھے۔

اس پھندے میں غزنی والوں کو وہ گائیڈ لے گیا تھا جو حملے سے پہلے غائب ہو گیا تھا۔ زخمی جانوروں نے بتایا کہ ان کے راجہ کو پتہ چل چکا تھا کہ غزنی کی فوج سومنات کو تباہ کر کے وہاں کا تمام خزانہ لارہی ہے۔ یہ گائیڈ راجہ کا بھیجا ہوا تھا۔

دوسرے دن فوج نے کوچ کیا تو پچھلے حصے پر جانوروں نے پھر حملہ کر دیا اور غائب ہو گئے۔ سلطان محمود نے فوج کو وہیں روک لیا اور زخمی جانوروں سے ختم نہیں بن کر ساتھ رکھ لیا گیا تھا تو چھان اُن کا دلرا ملکومت کمان ہے۔ قیدیوں نے بتایا کہ وہاں جاکر سلطان پریشان ہو گا۔ جانوروں کا کوئی ایک ٹھکانہ نہیں۔

سلطان کے سالاروں نے اسے مشورہ دیا کہ فوج جم کر لڑنے کے قابل نہیں۔ اس کے علاوہ اس دشمن اور اس علاقے سے ہمیں ذرا سی بھی واقفیت حاصل نہیں، اس کے خلاف کوئی معلوم نہیں کیا نقصان پہنچائے۔ زخمی قیدیوں پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ سلطان نے یہ مشورہ قبول کر لیا لیکن کئی جگہوں پر جانوروں نے غزنی کی فوج پر کبھی رات کو کھیمپ ہرا دیکھی دن کو پچھلے حصے پر حملے کیے اور گھوڑے سرپٹ دوڑاتے غائب ہو گئے۔

جانوروں نے غزنی کی فوج کا بہت نقصان کیا لیکن یہ نقصان جانی تھا۔ وہ سومنات کے خزانے تک نہ پہنچ سکے۔ سلطان محمود راستہ ہٹا رہا گیا۔ فوج کی نفی اور کم ہو گئی۔

*

پہلی ایک اختلاف اور ایک دکھپ کمانی سنا ضرور دی ہے۔ زیادہ تر مورخوں نے لکھا ہے کہ سلطان محمود نے راجہ دیو آسرم کو سومنات کا گورنر مقرر کیا تھا جس کے خلاف یہ سچے کو یہاں سے مالیہ جمع کر کے اس کا کچھ حصہ غزنی بھیجا کرے اور یہاں ہندو دوبارہ مندر تعمیر نہ کریں۔ عبادت کے لیے کہیں اور مندر کھڑا کر لیں اور اس علاقے میں جو مسلمان رہتے ہیں انہیں ہندو پریشان نہ کریں۔ کوئی

سلطان محمود غزنوی پہنچا تو شہر میں داخل ہونے سے پہلے اُس نے گھوڑے سے اتر کر شکرانے کے دُعا پڑھے۔ اُس نے خدا کا شکر فرج کا نہیں بلکہ خیریت سے غزنی پہنچ جانے کا ادا کیا تھا۔ وہ جس راستے سے آیا تھا اس کی صوبتوں اور دیگر دشواریوں سے پہلے واقف نہیں تھا۔ وہ ۱۰۶۶ء (۱۱ صفر ۴۵۷ھ) غزنی پہنچا تھا۔

غزنی کی ساری آبادی اُمڈ کے باہر آگئی تھی۔ عورتیں جنگی تڑانے کا رہی تھیں اور دُور سے فرج کی بلایں لے رہی تھیں۔ لوگ ناخراج رہے تھے۔ لوگ رات کو بھی نہ سوئے۔ جوں جوں لوگوں کو پتہ چلتا جاتا تھا کہ اب کے کیا فرج حاصل کی گئی ہے اُن کی مسرت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

رات کو سلطان محمود غزنوی غیر معمولی تھکان محسوس کر رہا تھا۔ تھکان تو وہ محسوس کیا ہی کرتا تھا لیکن اب وہ صاف طور پر محسوس کرنے لگا تھا کہ اُس کے اندر کوئی کمزوری پیدا ہو گئی ہے۔ ہر جنگی ہم کے بعد جب سلطان گھڑا آتا تھا تو اُس کا طبیب اُس کا پورا جسمانی معائنہ کرتا تھا۔ اب بھی رات کو طبیب آگیا۔ اُس نے نبض پر ہاتھ رکھا، پھر دل پر ہاتھ رکھا اور سلطان سے بہت کچھ پوچھا طبیب کے چہرے پر تشویش کے آثار آ گئے۔

”سلطان محترم! طبیب نے کہا۔“ جتنی تشویش مجھے آپ کی صحت کے متعلق ہے، اتنی آپ کو بھی ہو تو آپ صحت یاب ہو سکتے ہیں۔ آپ بیمار ہیں سلطان! آپ کو کم از کم ایک سال کے آرام کی ضرورت ہے۔“

”کیا بیماری ہے مجھے؟“ سلطان نے پوچھا۔ ”کیا آپ کو معلوم نہیں کہ میں کہاں سے آ رہا ہوں اور کیا کر کے آ رہا ہوں اور میں نے کتنی کھٹن مسافت طے کی ہے؟ اسے آپ بیماری کہہ رہے ہیں؟“

”جی ہاں سلطان محترم!“ طبیب نے کہا۔ ”جو میں جانتا ہوں وہ آپ نہیں جانتے۔ جس طرح آپ گھوڑے اور اونٹ کے فرق کو جانتے ہیں اسی طرح میں جھکن اور بیماری کے فرق کو پہچانتا ہوں۔“

سلطان کی بیوی اور ایک بیٹی بھی وہاں موجود تھیں۔ انہوں نے گھبرا کر پوچھا کہ سلطان کو کیا بیماری ہے۔ طبیب نے انہیں ٹال دیا۔ سلطان نے انہیں کہا کہ وہ چل جائیں، یہ صرف تھکن ہے۔

اُن کے جانے کے بعد سلطان نے طبیب سے پوچھا کہ اُسے کیا بیماری ہے۔ ”آپ کے جسم میں بیماریوں کے خلاف قوتِ ملافت ختم ہو چکی ہے۔“ طبیب نے کہا۔ ”میں آپ کو پہلے بھی خبردار کر چکا ہوں۔ کیا آپ محسوس نہیں کر کے کہ آپ کا سانس پھول جاتا ہے؟.... میں آپ کو ڈرانا نہیں چاہتا لیکن نہ بتانا بھی خطرناک ہے.... آپ کو سبب کا مرض لاحق ہو چکا ہے۔ ابھی ابتداء ہے۔“

”سل میرا کیا بگاڑ لے گا؟“

”سلطان عالی مقام!“ طبیب شیخ الاسفند نے جواب دیا۔ ”اسے آپ دیکھ سمجھ لیں جس طرح دیکھ لگتی کو کھا جاتی ہے اسی طرح سبب کو اندر سے کھوکھلا کرتا رہتا ہے۔ اگر آپ طویل آرام کریں اور ذہن سے تفکرات اور مسائل اُتار دیں تو میں اس مرض کو اسی مرحلے میں روک لوں گا۔ آپ کے اعصاب ختم ہو چکے ہیں۔“

”کیا آپ روحانی قوت میں یقین رکھتے ہیں شیخ الاسفند؟“

”لیکن روح کب تک ساتھ دے گا؟“ طبیب نے جواب دیا۔ ”جب جسم رُوح کو اپنے اندر رکھنے کے قابل نہیں رہتا تو رُوح اس کی قید سے آزاد ہو جاتی ہے۔“

”میں نے ہندوستان کے لوگ دیکھے ہیں۔“ سلطان محمود نے کہا۔ ”انہوں نے اپنے آپ میں ایسی قوتیں پیدا کر رکھی ہیں جو مافوق الفطرت لگتی ہیں لیکن وہ کہتے ہیں کہ ایسی قوت ہر انسان اپنے آپ میں پیدا کر سکتا ہے۔ کیا میں ایسی قوت سے محروم ہوں؟“

”میں پھر بھی جسم کی بات کر رہا ہوں۔“ طبیب نے کہا۔ ”اگر جسم کو سبب کی دیکھ

”میں نے سومات اسی قوت کے بل بوتے پر فتح کیا ہے شیخ الاسفذا۔“
سلطان محمود نے کہا۔ ”مجھے یاد ہے، ہندوستان کی طرف کوچ سے پہلے آپ
نے مجھے خبردار کیا تھا لیکن آپ میری نصیحت سے پتہ نہیں چلا سکے تھے کہ یہ بیماری
اُس وقت بھی مجھے کھارہی تھی۔ آپ نے مجھے اس کا نام بتا دیا ہے۔ میں اسے
صرف بیماری کہتا تھا۔۔۔ شیخ الاسفذا! میں آپ سے ایک وعدہ لینا چاہتا ہوں۔
کسی کو پتہ نہ چلے دیں کہ میں ریل میں مبتلا ہوں؟“

”میں اسے ریل کہہ رہا ہوں۔“ طبیب نے کہا۔ ”لیکن مجھے شک ہے کہ
یہ انہی ریلوں کا دق ہے۔ اگر آپ نے آرام اور پرہیز نہ کیا تو تھوڑے ہی عرصے بعد
پتہ چل جائے گا کہ یہ ریل ہے یا دق ہے۔“ طبیب نے التجا کے لہجے میں کہا۔
”اس سے پہلے کہ یہ ظاہر ہو کہ یہ ریل ہے یا دق آپ علاج آرام اور پرہیز کی
طرف توجہ دیں۔“

”میرے مرجانے سے کیا فرق پڑے گا؟“ سلطان نے کہا۔ ”میرے
بیٹے اس قابل ہیں کہ سلطنت غزنی کو سنبھال لیں گے۔“

”اس خاندان میں سلطان بہت پیدا ہوں گے۔“ طبیب نے کہا۔
”آپ کے بیٹوں کے بیٹے بھی سلطان ہوں گے مگر ایک اور محمود پیدا نہیں ہوگا۔ کوئی
بہت لیکن پیدا نہیں ہوگا۔ اللہ اور رسول کا نام تو سب لیں گے مگر ان ناموں پر اپنا
آپ قربان کر دینے والا کوئی نہیں ہوگا۔ ہندوستان سے پتھروں کے خدوؤں کے
مکڑے غزنی کی مسجدوں کے آگے پھینکے والا کوئی نہیں ہوگا۔ میں آپ کو آپ کے
لیے نہیں، آپ کے خاندان کے لیے نہیں، آپ کی سلطنت کے لیے نہیں، اسلام
کے لیے اور عالم اسلام کی عظمت کے لیے کچھ عرصہ اور زندہ دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”زندگی اور موت آپ کے اختیار میں نہیں شیخ الاسفذا۔“ سلطان نے کہا۔
”مجھے دنیا میں ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ عالم اسلام کی طرف کچھ سانپ بیٹھتے
چلے آ رہے ہیں۔ مجھے ان کے سر کھینچنے ہیں۔ مجھے ہندوستان کے ناک کو مارنا
ہے۔ وہ میری اتنی زیادہ ضربوں سے ابھی مرا نہیں۔ مجھے ہندوستان کے مسلمانوں

کو محفوظ کرنا ہے۔ مجھے سومات جاکر معلوم ہوا کہ وہاں کے ساحلی علاقوں میں محمد بن قاسم
کے وقتوں کے مسلمان رہتے ہیں۔ وہ سومات کے مناراج کے ظلم کا نشانہ بنے ہوئے
تھے۔ اُن کی غفلت دیکھتے کہ وہ ابھی تک عربی زبان بولتے ہیں۔ مجھے سومات
پر حملے کی ترغیب دینے والوں میں یہ مسلمان بھی تھے۔ مجھے ابھی بہت کچھ کرنا
ہے۔ میرا فرض ابھی پورا نہیں ہوا۔“

”اور اگر میں نے اپنا فرض پورا نہ کیا تو اسلام کے پاسبان اور علمبردار کا خون
میری گردن پر ہوگا۔“ طبیب نے کہا۔ ”میں خدا کو کیا جواب دوں گا؟“

”خدا دیکھ رہا ہے۔“ سلطان نے کہا۔ ”خدا سُن رہا ہے۔ آپ لے اپنا فرض
ادا کر دیا ہے۔ آپ صرف یہ کرم کریں کہ کسی کو پتہ نہ چلے دیں کہ میرے جسم کو ایسی
دیمک لگ چکی ہے جو اسے تیزی سے کھا رہی ہے۔ اگر یہ خبر میرے دشمنوں تک
پہنچ گئی تو وہ میری موت کے انتظار میں دیک کر بیٹھ جائیں گے اور اُس وقت
انٹیکس گے جب میرا جنازہ اٹھ جائے گا۔ شاید میرے بیٹے انہیں دبا نہ سکیں۔ کیا
آپ دیکھ نہیں رہے کہ سلجونی پھر سر اٹھا رہے ہیں اور وہ سلطنت غزنی کے لیے
کتنا بڑا خطرہ بن گئے ہیں؟“

”میں سب کچھ دیکھ رہا ہوں سلطان!“

”اور مجھے ہندوستان ایک بار پھر جانا ہے۔“ سلطان محمود نے طبیب کی سُنی
اُن سُنی کرتے ہوئے کہا۔ ”میں جب سومات سے واپس آ رہا تھا تو راستے میں ہندوؤں
کی جاٹ قوم نے میری فوج کو بہت نقصان پہنچایا۔ میری فوج وہاں جم کر ڈھکیں
سکتی تھی لیکن جاٹ چھاپہ مار جنگ لڑ رہے تھے۔ میں نے اس قوم کے بگٹی قبیلوں
سے معلوم کیا ہے کہ یہ کیسی قوم ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ یہ سومات کے شودیوں کی
بیماری قوم ہے اور یہ بہت طاقتور ہے۔ اتنی طاقتور کہ کسی وقت ارد گرد کے
ہمارا جوں کو ختم کر دے گی اور یہ قوم مسلمانوں کی جانی دشمن ہے۔۔۔ مجھے اس قوم
کی سرکونی کے لیے جانا ہے۔ اگر اس قوم کا دم ختم نہ توڑا گیا تو سومات کے شودیوں کا بہت
کھپیں اور کھڑا کر لیا جائے گا اور اس کے قدموں میں مسلمانوں کو ذبح کیا جائے گا۔“

رکھ کر گزرنے لگے۔

سلطان محمود نے اگلے ہی روز ہندوستان پر ایک اور فوج کشی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اُس نے اُسی روز لاہور کے گورنر یاز اور سلطان کے حاکم کے نام پیغام روانہ کر دیئے کہ وہ جانوں کے متعلق ہر ایک ضروری اطلاع فراہم کریں۔ ان کی تعداد، ان کا علاقہ، ان کے لڑنے کا طریقہ اور ہر وہ اطلاع جو کام آسکے۔ سلطان کی فوج خاصی کم ہو گئی تھی۔ اُس نے نئی بھرتی کا حکم دے دیا اور ساتھ یہ حکم بھی دیا کہ چھاپہ ماروں کی تربیت اور مشقیں تیز کر دی جائیں اور ہر سپاہی کو چھاپہ مار جنگ کی اور گھوم پھر کر لڑنے کی تربیت دی جائے۔ سلطان محمود نے طبیب کی تشویش ناک باتوں کو ذہن سے اتار دیا تھا۔ اُس نے آرام کی پروا نہ کی۔ پرہیز کی طرف توجہ نہ دی اور فوج کی تربیت اور سلطنت کے انتظامی کاموں میں مصروف ہو گیا۔

اور وقت بہت تیزی سے گزرنا لگا۔ تین چار ماہ بعد اُسے عمان اور لاہور سے جانوں کے متعلق رپورٹیں ملنے لگیں۔ یہ قوم سندھ کے علاقے میں پھیلی ہوئی تھی۔ تعداد خاصی زیادہ تھی۔ ان کے لڑنے کے طریقوں میں ایک تو شجوں تھے اور دوسرا طریقہ درہلی جنگ تھا۔ وہ کشتیوں میں لڑتے تھے۔ دریائے سندھ نے بہت رخ بدلے ہیں۔ اُس دور میں جانوں کے علاقے میں سندھ کا پاٹ اتنا چوڑا تھا کہ اس میں جزیرے بنے ہوئے تھے جن میں جنگل تھے۔ جاٹ ان جزیروں میں چلے جاتے تھے یا ان کی کچھ تعداد سندھ کے اُن دلدلی جنگلوں میں چلی جاتی تھی جنہیں انگریزوں کے دور حکومت میں ٹرول نے انگریزوں کے خلاف استعمال کیا تھا۔

سلطان محمود لاہور اور عمان سے تفصیلی اطلاعاتیں ملیں کہ جاٹ مسلمانوں کے لیے خصوصاً بہت بڑا خطرہ بن گئے ہیں اور وہ سومات کی تباہی کا انتقام ہندوستان کے مسلمانوں سے لیں گے۔ اُس وقت سلطان محمود لاہور، عمان اور بھیر (تقریباً کراچی کے تمام تر نیچے) اپنی سلطنت میں شامل کر چکا تھا اور کشمیر سے قنوج تک

”آپ آرام کر لیں۔“ طبیب نے کہا۔ ”میں دوائی دوں گا۔“
”دعا بھی دیں شیخ الاسفند!“ سلطان نے کہا۔ ”مجھے اب دعاؤں کی زیادہ ضرورت ہے۔“

*

طبیب چلا گیا تو سلطان کی بیوی اور بیٹی آگئیں۔
”وہ کیا بتا سکتے ہیں؟“ بیوی نے پوچھا۔ ”آپ نے ہمیں باہر کیوں نکال دیا تھا؟“
”طبیب کہتا ہے آرام کرو۔“ سلطان نے کہا۔ ”اور اپنے فرائض کو بھول جاؤ۔“
”تو اس کی کوئی وجہ ہوگی نا؟“ بیٹی نے کہا۔
”کہتا ہے میرے جسم میں کچھ کمزوری پیدا ہو گئی ہے۔“ سلطان نے کہا۔
”آپ آرام کریں جیسے شیخ الاسفند کہہ گئے ہیں۔“ بیوی نے کہا۔ ”میرے کو کھ سے جن بیٹوں نے جنم لیا ہے وہ آپ کے فرائض پورے کر دیں گے۔“
”وہ سبوتوں کو نہیں دبا سکیں گے۔“ سلطان نے کہا۔ ”وہ ہندوستان کے جانوں کا ستر نہیں کھلیں گے۔ میں یہ دونوں کام کر کے مروں گا۔“
ابرونی نے لکھا ہے کہ سلطان محمود کا چہرہ بکھا ہوا تھا۔ اُس کی شوخی ماند پڑ گئی تھی۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ اندرونی کشمکش میں مبتلا ہے۔ طبیب اُسے آرام کے لیے کہہ گیا تھا لیکن سلطان نے اُسی وقت متعلقہ حکام کو بلایا اور انہیں حکام دینے لگا۔ احکام یہ تھے کہ کل وہ دیکھنا چاہتا ہے کہ سومات کے بت کا ایک ٹکڑا میرے دروازے کے آگے اور ایک ٹکڑا جامع مسجد کے دروازے کے آگے اس طرح رکھا ہوا ہے کہ اندر آنے اور جانے والوں کے پاؤں ان ٹکڑوں پر پڑتے ہیں۔ مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ کے ٹکڑے صبح ہوتے ہی خلیفہ کو روانہ کر دیئے جاتے ہیں۔

اگلے روز اُس کے محل اور مسجد کے آگے ٹکڑے زمین میں اس طرح رکھے گئے کہ اوپر سے ننگے تھے۔ لوگ انہیں دیکھنے کے لیے جمع ہو گئے اور ان پر پائیاں

کے راجے مہاراجے اُس کے ہاجکزار تھے اس لیے کوئی خطرہ قبول نہیں کیا جاسکتا تھا۔ تاریخوں میں آیا ہے کہ سلطان محمود جاٹوں کو مزارینا چاہتا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی سلطنت کے ہندوستانی علاقوں اور ہندوستان کے مسلمانوں کا تحفظ چاہتا تھا اور یہ بھی کہ سومات کاسندر دوبارہ تعمیر نہ ہو اور ہندو اُس شوہر کو پھر سے زندہ نہ کر سکیں جس کے متعلق ہندوؤں کا باطل عقیدہ تھا کہ وہ انسانوں کو دوسرا جنم دیتا ہے۔

اگست ۱۰۲۹ء میں طمان سے اطلاع گئی کہ جاٹ جنگی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اس کا پس منظر یہ بیان کیا گیا کہ طمان کا ایک مقامی مسلمان جو دہاں جاسی کرنے گیا تھا، پکڑا گیا تھا اور وہ کچھ دنوں بعد وہاں سے فرار بھی ہو گیا تھا۔ اُس پر نیم دیوانگی طاری تھی۔ وہ جاٹوں کے علاقے میں ایک بھٹکے ہوئے مسافر کے بھیس میں گیا اور اُس نے دہاں جا کر دلیری یا حماقت یہ کہی کہ جاٹوں کے جرمزوں کو قریب سے دیکھنے کے لیے چھوٹی سی ایک کشتی چرائی مگر کشتی رانی نہیں جانتا تھا۔ وہ ساوان کی موسلا دھار بارشوں کا ہینہ تھا۔ دریا میں طنبانی تھی۔ چھوٹی سی کشتی کو دریا اپنے ساتھ ہی لے گیا، پھر کشتی اُلٹ گئی اور وہ تیرتا ہوا اس حالت میں ایک جزیرے سے جا لگا کر خشکی پر پہنچے ہی بے ہوش ہو گیا۔

ہوش میں آیا تو وہ جاٹوں کی ایک بھٹی میں پڑا تھا اور دو عورتیں اُس کے قریب بیٹھی تھیں۔ ان میں ایک جوان تھی۔ اُس نے اس آدمی سے پوچھا کہ وہ کہاں کلہ رہنے والا ہے اور دریا میں کس طرح گر پڑا تھا۔ اُس نے غلط بیانی کی لیکن دو جاٹوں نے اُس کو اُس کے ساتھ باتیں کیں تو انہیں اس پر شک ہوا۔ اس کی حالت بہت بُری تھی۔ جاٹوں نے اُسے اٹھالیا اور کہا کہ اسے وہ دریا میں پھینک دیں گے۔ اس نے جان کے دُور سے بتا دیا کہ وہ مسلمان ہے، طمان سے آیا ہے اور وہ جاسوس ہے۔ جاٹوں نے اُسے اور زیادہ پریشان کیا تو اُس نے بتا دیا کہ غزنی کی فوج اُن پر حملہ کرنے اور انہیں ختم کرنے آرہی ہے۔ اُسے جو کچھ معلوم تھا وہ اُس نے بتا دیا، لیکن جاٹ اُسے رہا نہیں کر رہے تھے۔

جاٹ اُس سے پوچھتے تھے کہ غزنی کی فوج کا لڑنے کا طریقہ کیا ہے۔ وہ بتاتا رہا اور ان پر اعتماد پیدا کرنے کے لیے اُن کا مشیر اور مخبر بن گیا۔ وہ بڑا مڑا اور خوبصورت جوان تھا۔ وہ جوان عورت جو پہلے روز اُس نے اپنے پاس بمبیشی دیکھی تھی، اُس میں کچھ ادب رہی کیسکی لے رہی تھی۔ اس عورت نے ایک روز اسے بتایا کہ اس کا خاندان قبیلے کے سرداروں میں سے ہے اور بوڑھا ہے، اس لیے وہ یہاں سے بھاگنا چاہتی ہے۔ طمان کے مسلمان جاسوس نے اُسے کہا کہ وہ یہاں سے نکلنے کا انتظام کرے تو وہ اُسے طمان لے جائے گا جہاں وہ جنگی عورت کی طرح نہیں رہے گی بلکہ اُسے رانی بنا کر رکھا جائے گا۔

اس عورت نے اُسے بتایا کہ اس سے پہلے بھی ایک جاسوس پکڑا گیا تھا جس سے جاٹوں نے معلوم کر لیا تھا کہ غزنی کی فوج ان پر حملہ کرنے آئے گی لیکن یہ معلوم کر کے بھی جاٹوں نے اُسے قتل کر دیا تھا۔ اُس روز سے جاٹ لڑائی کی کشتیاں تیار کر رہے تھے۔

ایک رات جب طنبانی ذرا کم تھی، یہ عورت جاسوس کے پاس آگئی اور اسے کہا کہ فوراً اٹھو۔ وہ اٹھا۔ عورت اُسے دریا کے کنارے لے گئی اور اُسے ایک کشتی میں بٹھایا۔ خود بھی بیٹھی اور دونوں چٹو مارنے لگے۔ ابھی زیادہ دُور نہیں گئے تھے کہ دریا کے کنارے مشعلیں بھاگتی دھڑکی دکھائی دینے لگیں۔ جاٹ انہیں بڑک جانے کو لکار رہے تھے۔ چاندنی میں انہیں کشتی نظر آرہی تھی۔ چار پانچ ریز آئے۔ عورت کی چیخ نکلی گئی۔ ایک تیرا اُس کے پہلو میں اتر گیا تھا۔ جاسوس محفوظ رہا۔ وہ کشتی میں لیٹ گیا اور کشتی کو دریا کے حوالے کر دیا۔ اُسے سالی دیتا رہا کہ کشتی میں تیر لگ رہے ہیں۔

جزیرہ چھوٹا تھا اور دیا تیز۔ کشتی جلدی خطرے سے نکل گئی۔ جاسوس نے چٹو مارنے شروع کیے۔ عورت سرخجی تھی۔ کشتی بہت دُور جا کر کنارے سے لگی۔ جاسوس کا جسم شل ہو چکا تھا، مگر وہ کہیں گرا اور کا نہیں۔ وہ جب بہت دنوں بعد طمان پہنچا تو اُس سے بولا بھی نہیں جاتا تھا۔ اُس نے جو کچھ جاٹوں کو بتایا تھا۔

چلانے والوں کی ہمارت دیکھی اور پھر ہر کشتی میں بیس بیس تیراٹزا اور برہمی باز سپاہی بٹھاکر پورے پیرے کو دریا میں اتارا اور کشتیوں کو تیزی سے گھمانے پھرانے کے احکام دیے۔ اس نے سپاہیوں کی پھرتی کا جائزہ لیا اور انہیں اکٹھا کر کے مزید ہدایات دیں۔

جس روز سلطان ملتان پہنچا اسی روز جاسوس جاٹوں کے علاقے میں بھیج دیے گئے لیکن سلطان کی تیاریاں بھی پوشیدہ نہیں تھیں۔ ملتان میں اگر جاٹوں کے جاسوس نہیں تھے تو مسلمانوں کے دشمن موجود تھے۔ بعد کی اطلاعوں کے مطابق جاٹوں کو سلطان کی تیاری اور کوچ کا پتہ چل گیا تھا۔ اس کی پہلی تصدیق جاسوسوں نے واپس آکر کر دی۔ انہوں نے بتایا کہ جاٹوں نے کم و بیش چار ہزار کشتیاں تیار کر لی ہیں اور وہ دریائی جنگ لڑنے کے لیے ان کا منصوبہ یہ تھا کہ غزنی والے کشتیوں پر آکر رہے ہیں اور پہاڑی جنگی پر لڑیں گے اس لیے انہوں نے غزنی والوں کو دریا میں ہی روک لینے اور دریا میں ڈبو دینے کا ارادہ کیا تھا۔

جاسوسوں نے یہ بھی بتایا کہ تمام جاٹ اپنی عورتوں اور بچوں کو ساتھ لے کر دریا کے جزیروں میں چلے گئے ہیں۔ خشکی پر یعنی جزیروں کے سوا اور کہیں کوئی جاٹ نہیں ملے گا۔ ان اطلاعوں کے مطابق سلطان محمود نے دریائی جنگ کی تیاری مکمل کر لی اور اپنے سالاروں کو اس نے بتا دیا کہ اب کچھ بھی ہو جائے، دریا میں ہی لڑا جائے گا۔

جو تاریخیں ہندوستان میں لکھی گئی ہیں، ان میں اس جنگ کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی یعنی غیر ہندوستانی مسلمان مصنفوں نے بھی اس کا ذکر سرراہ سے کیا ہے لیکن دفاعی لگازوں اور گہری تحقیق کرنے والوں کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ جنگ غزنی والوں کی کلاسیکی بحری جنگ تھی جس میں سلطان محمود اور اس کے سالاروں نے بے مثال جنگی بصیرت کا مظاہرہ کیا۔

وہ مقام بھی نے بھی نہیں لکھا جہاں یہ لڑائی لڑی گئی تھی۔ ایک انگریز جان برگس نے جس نے محمد قاسم فرشتہ کی کتابوں کا ترجمہ انگریزی میں کیا ہے، حاشیے

اور جاٹوں کے متعلق اسے جو کچھ پتہ چلا تھا، وہ اس نے بتایا۔

جب یہ رپورٹ سلطان محمود کے پاس پہنچی تو اس نے اپنے سالاروں سے مشورہ کر کے ملتان کے حاکم کو پیغام بھیجا کہ جس قدر جلدی ممکن ہو سکے کشتیوں کا ایک بیڑہ تیار کیا جائے۔ ہر کشتی میں سپاہیوں کے لیے کافی ہو۔ سلطان محمود ایک بار دیگا جیموں میں خوارزم شاہ کی فوج کے خلاف کشتیوں کی جنگ لڑ چکا تھا۔ اس تجربے کے بعد اس نے خاص قسم کی جنگی کشتیاں بنوائی تھیں۔ اب اس نے انہی کشتی سازوں اور چند ایک تجربہ کار ملاحوں کو ملتان بھیج دیا تاکہ وہ جنگی ضروریات کے مطابق کشتیاں تیار کر لیں۔

*

دسمبر ۱۰۲۷ء کے آخری ہفتے میں سلطان محمود کو ملتان سے اطلاع ملی کہ ایک ہزار کشتیاں تیار ہو چکی ہیں۔ دوسری اطلاع طویل تھی جو جاٹوں کی جنگی تیاریوں سے متعلق رکھتی تھی۔

سلطان محمود پر ایک الزام یہ عائد کیا جاتا ہے کہ وہ لوٹ مار کے لیے ہندوستان میں آتا تھا اور خزانے سمیٹ کر چلا جاتا تھا۔ اس الزام کی تردید میں اس جنگ کا ذکر ضروری ہے جو اس نے جاٹوں کے خلاف لڑی تھی۔ جاٹوں کی کوئی ریاست نہیں تھی اور ان کا کوئی خزانہ بھی نہیں تھا۔ وہ سچو قیوں کی طرح جنگی قوم تھی جو مذہب کے رشتے سے ہمارا جوں کے کام کی جنگی طاقت بنتی جا رہی تھی۔ اس قوم کو رہن اور ڈاکو کہا جاتے تو زیادہ موزوں ہو گا۔ سلطان محمود کے دل میں جاٹوں کے خلاف یہ عداوت تھی کہ جاٹ ٹرویلو کے پجاری تھے اور مسلمانوں کے بدترین دشمن۔ وہ مسلمانوں کو قتل و غارت سے ختم کرنا چاہتے تھے۔ لہذا سلطان کے غم کے پس منظر میں ہندوستان میں اسلام کا اچھا تھا۔

مارچ ۱۰۲۷ء (۴۱۸ھ) کے آخری دنوں میں سلطان محمود نے غزنی سے کوچ کیا۔ وہ جب ملتان پہنچا تو اسے بتایا گیا کہ ایک ہزار چار سو کشتیاں تیار ہو چکی ہیں سلطان نے آرام کے بغیر کشتیوں کا معائنہ کیا۔ ایک کشتی میں خود بیٹھ کر دریا میں گیا۔ کشتی

میں لکھا ہے کہ یہ اتفاق کی بات ہے کہ سلطان محمود نے اس مقام پر یہ جنگ لڑی جس جہاں تیرہ صدیاں پہلے سکندر اعظم نے کشتیوں کا بیڑہ تیار کر کے دیا میں اہل تھلہ نقتے پر دیکھیں۔ ملتان دریا تے پنجاب کے کنارے پر ہے۔ وہاں دریا تے جہلم راوی اور پنجاب ایک دریا بن جاتے ہیں۔ آگے جا کر دریا تے ستلج بھی اس میں مل جاتا ہے اور کچھ اور آگے، اُنج سے بھی آگے یہ دریا تے سندھ میں مل جاتے ہیں۔ وہاں پنجاب کے تمام دریا مل کر دریا تے سندھ بن جاتے ہیں۔ آگے جا کر وہ چھوٹے دریا بھی دریا تے سندھ میں گرتے ہیں۔ اُس دہر میں کسی بھی دریا سے نہریں نہیں نکالی گئی تھیں، نہ کسی دریا پر کوئی ڈیم یا بیراج تھا۔ تمام تر پانی بلارک لوک بہتا تھا۔ تصور کیا جاسکتا ہے کہ اتنے سارے دریا مل کر جب دریا تے سندھ بنتے تھے تو اُس دہر میں یہ دریا چھوٹا سمندر بن جاتا ہو گا۔ پاٹ بہت چوڑا تھا اس لیے دریا کے درمیان میں جھگلائی جزیرے بن گئے تھے۔ بعض جزیرے خالص وسیع تھے۔

*

تاریخ دان اُس تاریخ کے متعلق خاموش ہیں جس دن یہ لڑائی شروع ہوئی تھی۔ سلطان محمود کا چودہ سو کشتیوں کا بیڑہ ملتان سے روانہ ہوا۔ فرشتہ لے لکھا ہے کہ غزنوی دالوں کی کشتیاں مضبوط تھیں اور اُن کے اطراف میں، سامنے اور پیچھے برہمیوں کی آبیوں کی طرح لہے کی بڑی بڑی نوکدار اینٹیاں لگا دی گئی تھیں تاکہ دشمن کی کشتیاں ان سے ٹکرائیں تو ٹوٹ جائیں اور دشمن کے آدمی دریا میں اتر کر کسی کشتی میں سوار نہ ہو سکیں۔ اس اہتمام کے علاوہ سلطان محمود نے پہلی بار انکے پھینکنے کا انتظام کیا تھا۔ جان بگس نے انہیں ہندو گرنیکا کہا ہے لیکن فرشتہ نے انہیں آتش گیر سیال کے ڈبے یا مٹی کے چھوٹے چھوٹے برتن کہا ہے۔

غزنوی دالوں کا بیڑہ دریا کے بہاؤ کے ساتھ بہتا گیا۔ کشتیوں کو ایک دوسری سے دُور دُور رکھا گیا۔ سلطان محمود کی کشتی درمیان تھی۔ اس کے ساتھ تین کشتیاں قادمین کی تھیں جن کے چوڑیاں تھیں۔

پانچ دہے آگے گئے تو جالوں کی کشتیاں نظر آنے لگیں۔ وہ نیم دائرے میں تھیں

اور اہل کشتیوں کے پیچھے ایسے لگتا تھا جیسے دہاں دریا نہیں، کشتیوں کا جھل ہے۔ سلطان محمود نے آگے پیچھے آنے والی کشتیوں کو ایک صف میں کر کے دریا کی چوڑائی میں کر لیا تاکہ جالوں کا نیم دائرہ گھیرے کی صورت اختیار نہ کر سکے۔ پہلے تیر جالوں کی طرف سے آئے۔ سلطان نے اپنی درمیان والی کشتیوں کو بھی وائیں اور بائیں ہوجانے اور جالوں کے پہلوؤں پر تیر برسانے کا حکم دیا۔ چونکہ غزنوی دالوں کی کشتیاں بہاؤ کے رُخ جہری تھیں اس لیے اُن کی رفتار تیز تھی اور ملاخوں کو چپو مارنے کی ضرورت نہیں تھی۔

قریب جا کر سلطان محمود نے تیر چلائے کا حکم دیا۔ تیر جالوں کی پہلوؤں میں کناہوں والی کشتیوں پر چلائے جا رہے تھے۔ جالوں کے تیر لٹک تھے۔ ان کی کھلی کشتیوں سے بھی تیر آ رہے تھے۔ غزنوی دالوں کی کشتیاں جالوں کے پہلوؤں پر چلی گئیں۔ پیچھے جو کشتیاں آ رہی تھیں، انہیں جالوں کے درمیان چلے جانے کو کہا گیا۔ اللہ اکبر کے نعرے گرجنے لگے اور جاٹ اپنی مخصوص کواڑیں گیلوں کی آواز میں نکال رہے تھے۔ وہ دیر لڑا کے تھے۔

تھوڑی دیر بعد دونوں طرف کی کشتیاں ایک دوسری میں گمراہ ہو گئیں۔ مسلمانوں نے جالوں کی کشتیوں پر آگ بھینکی شرم کر دی۔ جالوں نے اس قدر دلیری کا مظاہرہ کیا کہ وہ جلتی ہوئی کشتیوں سے کوڈ کر دریا میں اترے اور مسلمانوں کی کشتیوں پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگے، لیکن مسلمانوں کی کشتیوں کے کناہوں پر جواتیاں لگی ہوئی تھیں، وہ انہیں برسی طرح زخمی کر رہی تھیں۔ اوپر سے مسلمانوں کی برہمیاں انہیں ختم کر رہی تھیں، لیکن جالوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اُن کی چار ہزار کشتیوں میں سلطان محمود کی ایک ہزار چار سو کشتیاں نظر نہیں آتی تھیں۔

مسلمانوں کی کشتیاں اُلٹے کی ٹریفنگ دی گئی تھی۔ ایک خاص زاویے سے کشتی کو کشتی سے گھیر ماری جاتی تھی۔ اس طرح مسلمانوں نے جالوں کی کشتیاں اُلٹ دس لیکن جاٹ پانی کے کپڑے معلوم ہوتے تھے۔ وہ دریا میں کوڈ جاتے اور مسلمانوں کی کشتیوں پر سوار ہونے کی کوشش کرتے تھے۔ مسلمانوں کا بھی نقصان ہو

رہا تھا۔ انہیں اس لحاظ سے برتری حاصل تھی کہ ان کے پاس کشتیوں کو چلانے کا انتظام بھی تھا۔

جائوں نے ایک چال اور چلی۔ چھپے کی کشتیوں میں جو جاٹ سوار تھے وہ کشتیاں کناروں پر لے گئے اور خشکی پر چلے گئے۔ یوں پتہ چلتا تھا جیسے بھاگ گئے ہوں لیکن خشکی پر چھپے چھپاتے غزنی والوں کے قریب کنارے سے اُن پر تیرا اور بچھیاں بڑھا۔

چھپاتے تھے لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ سلطان محمود نے یہ انتظام بھی کیا تھا کہ کناروں سے دُور جائوں کی نظروں سے اوچھل اپنی فوج کے دستے رکھے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ کشتیوں میں ہی آئے تھے۔ رات کو انہیں اُٹا کر خشکی پر بھیج دیا گیا تھا۔ وہ کناروں سے دُور چلے گئے تھے۔ جاٹ سلطان کے اس انتہائی واقف نہیں تھے۔ جو جاٹ خشکی سے غزنی کی کشتیوں پر تیر چلانے گئے تھے وہ دوبارہ نظر نہ آئے۔

انہیں خشکی میں چھپے ہوئے غزنوی بھادروں نے تیروں سے ختم کر دیا پھر جو جاٹ کنارے پر جاتا تھا وہ زندہ واپس نہیں آتا تھا۔ سلطان محمود نے خشکی پر اپنی حفاظت کا یہ انتظام اتنا خفیہ رکھا تھا کہ جاٹ اس سے قبل از وقت باخبر نہ ہو سکے۔

جائوں کو سب سے زیادہ نقصان غزنی والوں کے آگ کے گولوں نے

دیا جو جس طریقے سے بھی آگ بھینکی جاتی تھی بہت نقصان پہنچایا۔ غزنی کے ملاح اپنی کشتیوں کو جائوں کی کشتیوں کی طرف کر کے اُن کشتیوں کی طرف دھکیلے تھے جو جل رہی ہوتی تھیں۔ کوئی انسان جل کر رہا نہیں جاتا۔ جاٹ جلی کشتی سے دیا میں کود جاتے تھے تو سنان تیر انداز انہیں اٹھہرے نہیں دیتے تھے۔ ملائیں تیر تیر کر ڈب رہی تھیں۔ جاٹ ملاحوں نے کشتیاں بہاؤ پڑوال دی تھیں اور مسلمان اُن کا تعاقب کر رہے تھے۔ کناروں پر بھی اُن کا قتل عام ہو رہا تھا۔

دوبارے شہر کا پانی لال ہو گیا تھا۔ زخمی دُوب رہے تھے۔ سلطان کی یہ چال جائوں کے لیے بہت ٹھیک ثابت ہوئی کہ سلطان نے اپنے ملاحوں سے کہا کہ وہ کشتیاں کناروں کے ساتھ رکھیں۔ اس طرح جاٹ بکھر کر لڑنے کی بجائے درمیان میں اکٹھے ہو گئے۔

کچھ ہی دیر بعد جائوں کی جارحیت ختم ہو گئی۔ انہیں طریقے سے لڑانے والا کوئی تھا۔ انہوں نے کشتیوں سے کودنا اور تیر کر خشکی پر جانا شروع کر دیا مگر دُمان موت اُن کی منتظر تھی۔ کشتیاں لڑتے لڑتے کسی جزیرے کے قریب سے گذر رہی تھیں تو غزنی کے سپاہی آگ جزیرے پر بھی بھینک دیتے تھے۔ اس طرح دو ایسے بڑے جزیروں کے ایک دو چھوٹوں کو آگ لگ گئی جن میں جائوں کے بیوی بچے تھے۔ چھوٹوں نے جھل میں آگ لگا دی۔ جائوں کے اوسان خطا ہو گئے۔ ان کے لیے اب دنیا میں بھی آگ تھی اور جزیروں میں بھی آگ۔

چند گھنٹوں میں یہ سب ختم ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی جاٹ بھی ختم ہو گئے۔ اس کے بعد سلطان محمود نے خود جزیروں میں اُتر کر دیکھا۔ کوئی بھی جوان یا نوجوان جاٹ کہیں چھپا ہوا نظر آیا اسے پکڑ کر کشتی میں ڈال لیا گیا۔ چھپے غریب اور بچے رہ گئے۔ جن جزیروں میں آگ لگی تھی وہاں سے غریب اور بچے بھاگے اور دنیا میں کود گئے۔ انہیں پانے والا کوئی نہ تھا۔ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی نسل ہی ختم ہو گئی۔ زندہ بچ رہنے والی غریبیں ادھر ادھر بکھر گئیں۔ اس کے بعد کسی نے نہ ساک جاٹ بھی کوئی قوم ہوا کرتی تھی۔

*

سلطان محمود جولائی ۱۰۱۷ء کے آخری دنوں میں واپس غزنی پہنچا۔ اب طیب نے اُسے دیکھا تو وہ بہت پریشان ہوا۔ سلطان کے چہرے پر اب کمزوری اور بیماری کے آثار تھے۔ سلطان اکوڑی اور گردیزی نے لکھا ہے کہ سلطان جب جائوں کی سرکوبی کے لیے گیا تو جزیروں کے جھل میں اُسے ایسے چھیدوں نے کاٹا ہوگا جو طیر پاکے جراثیم کے حامل تھے۔ ان سے اُسے طیر ہوا ہوگا جو سلطان بیماری کی پرواہ نہیں کیا کرتا تھا اس لیے اُس نے غزنی ان طیبوں کو جو اُس کے ساتھ گئے تھے، نہ بتایا کہ اُسے کوئی تکلیف ہے۔ یہ طیر باکڑ کرنا یاں طہر برق کا مرض بن گیا، یا یہ کہا جاسکتا ہے کہ سِل یا دق کا جو عارضہ اُسے لاحق ہو چکا تھا وہ طیر پاکے بخار سے نمایاں ہو گیا۔ دوسرے سوزخوں نے اسے انتر لایا۔ کا دق لکھا ہے۔

یہ جو کچھ بھی تھا اس کا باعث یہ تھا کہ سلطان کی ۵۹ سالہ زندگی کے چالیس سال

میدان جنگ میں یا کوئٹہ میں یا پراڈ میں گزر رہے تھے۔ اُس نے ۱۲ سال حکومت کی تھی۔ وہ جب اپنے گھر میں ہوتا تھا تو اُس کے ذہن اور اعصاب پر سوچوں کا بوجھ بڑا رہتا تھا۔

”سلطان نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں کسی کو نہیں بتاؤں گا کہ سلطان ایک مہلک مرض میں مبتلا ہو چکا ہے۔“ ایک روز سلطان کے طبیب شیخ الاسفند نے سالار ابو عبد اللہ محمد الطائی، ارسلان جاذب، البرکن اور وزیر سے کہا۔ ”لیکن میں یہ راز آپ سے مزید پوشیدہ نہیں رکھ سکتا۔ سلطان محمود اپنی بیوی اور اپنی اولاد کا مسکہ نہیں۔ وہ ملت اسلامیہ کا گوہر نایاب ہے۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ محمد بن قاسم کے کتنے سو سال بعد غزنی نے دوسرا محمد بن قاسم پیدا کیا مگر اُس وقت تک ہندوستان بیت خاندن چکا تھا اور محمد بن قاسم کی جلائی ہوئی نسخ رسالت ٹٹانے لگی تھی۔ اس کا نور سمٹ گیا تھا۔ اب محمود ہاتھ سے جا رہا ہے۔ پھر کون جانے کب کوئی اور قاسم اور کب کوئی اور محمود اٹھے۔ اُس وقت تک ہند کے ٹیٹ خانے اور بے خانے پھر آباد ہو چکے ہوں گے اور اسلام پر کفر کا خوف دہرا س طاری ہو چکا ہو گا۔“

”کیا ہو گیا ہے سلطان کو؟“ وزیر نے پوچھا۔
 ”وق... برل...“ طبیب نے کہا۔ ”میں نے تشخیص اب نہیں کی۔ وہ کئی سال سے اس مرض کو اپنے اندر پالی رہا ہے۔ ہمارے سلطان نے بڑے بڑے طاقتور دُشمنوں کو ہی شکست نہیں دی۔ وہ موت کو بھی شکست دیتا چلا آ رہا ہے۔ وہ جتنے عرصے جس مرض کا مریض ہے، کوئی اور ہوتا تو کئی سال پہلے مر چکا ہوتا۔ اُس کا اخصابی نظام پہلے ہی تباہ ہو چکا تھا۔ جسم بیماریوں کے خلاف قوت مدافعت کھو بیٹھا تھا۔ وہ روحانی قوت سے لڑتا رہا ہے سلطان نے ثابت کر دیا ہے کہ ارادہ مضبوط اور عزم بلند ہو، نیت اور مقصد میں عظمت ہو تو رُوح کی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں اور جسم کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ سلطان ان خداداد قوتوں کے بل بوتے پر زندہ ہے۔ کیا آپ لوگ سلطان کو قانی کر سکتے ہیں کہ وہ اب ہر طرف سے توجہ سٹالیں اور صرف علاج پر توجہ مرکوز کریں؟... یہ سلطان کے خاندان پر نہیں، عالم اسلام پر احسان

ہو گا۔ یہ ہندوستان کے مسلمانوں پر احسان ہو گا جنہوں نے صدیوں بعد خیر سے سزا ٹھہرایا ہے اور انہیں ہندوستان میں کھو یا ہوا دار ملا ہے۔ سلطان اب اس حالت کو پہنچ گیا ہے کہ اسے بستر سے اٹھنا نہیں چاہیے۔“

سلطان محمود بستر کا تیدی نہ رہ سکا۔ اُس کا اندر اور اُس کے سالار اس کے ماتحت صرف حاکم نہیں تھے بلکہ اُس کے دوست تھے، اُس کے راز دار تھے، اُس کے لنگوٹے پار تھے۔ انہوں نے شانہ بٹانہ نہ مار سچ بنائی تھی۔ موت کو آنکھیں دکھائی تھیں۔ بڑے بڑے لمبے کوچ کئے تھے مگر بیماری کی بات ہوئی تو سلطان ان کا قائل نہ ہوا۔ اُس نے سب کو ہنس کر ٹال دیا۔ اُس نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ جو دوست مجھ میں ہے وہ تم میں بھی ہے۔ اسے بیدار کرو۔ عزم اور مقصد کو بند رکھو۔ حکم صرف خدا سے لو، قرآن کو مشعل راہ بناؤ۔ روحانی قوتیں بیدار ہو جائیں گی۔

اُس کے گھر والے اور اس کے حکام جب اُس کی صحت کے متعلق تشویش میں تھے اُس وقت سلطان ایک اور جنگی مہم پر روانہ ہو گیا۔ یہ سلجوقیوں کے خلاف تھی۔ سلطان کی غیر حاضری میں سلجوقی ہندوستان کے جاٹوں کی طرح ایک قوت بن گئے اور سلطنت غزنی کو بھی لٹکانے لگے تھے۔ ان کے خلاف اُس نے آخری جنگ لڑی اور ان کا دم خیم توڑ کر استہقان اور رعب کو اپنی سلطنت میں لے لیا اور اپنے بیٹے مسعود کو دہلی کا امیر مقرر کر دیا۔

دہ آب دہوا کی تبدیلی کے لیے بلج چلا گیا مگر آرام نہ کیا۔ اپنی تمام سلطنت کے دورے کرتا رہا۔ سلطنت کے امور اور مسائل سے ابھارا۔ اُس نے ۱۰۶۹ء کا موسم گرما اور سردیاں بلج میں گزارا مگر دہلی کی آب دہوا اس نہ آتی۔ اس آس بھی نہیں کی تھی۔ اب دنیا کی آب دہوا اُس کے لیے نہیں رہی تھی۔ اُس نے غزنی چلے جانے کا فیصلہ کیا۔

سلطان ۲۰ اپریل ۱۰۷۳ء کے روز غزنی آیا۔ آتے ہی اُس پر نیم غشی طاری ہو گئی۔

اگر مقبرے کا نشان مٹ جائے تو بھی سلطان محمود غزنوی زندہ و پابند رہے
ملا۔ محمود ایک روایت کا نام ہے۔ اُسے سومات کے شہر دیو کے وہ کھڑے زندہ
رکھے ہوئے ہیں جو آج بھی غزنی میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں پڑے ہوئے
ہیں اور سلطان ابن پر پائل رکھ کر گزرتے ہیں۔

طیب نے دیکھا تو اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اُس نے سلطان کے
کان میں کہا۔ ”کچھ کیستے سلطان!“۔ سلطان نے اپنا ایک ہاتھ اٹھا کر مگر ہاتھ پسنے پر
گرہڑا۔ اُس کی بیوی نے بلایا۔ بیوی نے بلایا۔ سلطان کی صرف سانسیں چل رہی تھیں۔
اُس کے پاس قرآن خواں بٹھادیا گیا جو خوش اکام تھا جب قرآن کی آواز سلطان
کے کانوں میں پڑنے لگی تو اُس کے چہرے پر پہلا ہٹ اور آخری وقت کی سیدی کم
ہونگئی۔ کسی کسی آیت پر اُس کا جسم کھٹکنا تھا جس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ سُں رہا ہے،
سمجھ رہا ہے مگر بڑے بڑے دہشت ناک دشمنوں کو گھٹنوں بٹھا دینے والا، پتھر کے
”خدا کی“ کو درزہ ریزہ کر دینے والا اب بول نہیں سکتا تھا، بول نہیں سکتا تھا۔

۱۱ اپریل ۱۱۳۰ء (۲۳ ربیع الثانی ۵۲۱ھ) بروز جمعرات شام پانچ بجے سلطان محمود
کے ہونٹوں پر بستم دیکھا گیا اور اس کے ساتھ ہی اُس نے آخری سانس لیا اور
دنیا سے سرخروئی کا قسم لیے رخصت ہو گیا۔

طیب دھار مار کر دیا اور بانگ بلند کہا۔ ”اس شخص نے موت سے بھی
ہتھیار دلو لیے تھے“

تاریخ اسلام کے بہت کمین اور ہندوستان میں ایسے اسلام کے علمبردار کو
اُسی رات غنا کی منازکے بعد مشطوں کی روشنی میں فیروز کی باغ میں دفن کر دیا گیا۔
وہ زندہ تھا تو یہ باغ اُسے بہت پسند تھا۔ ذرا ستانے کے لیے اسی باغ میں بیٹھا
کرنا تھا۔

اُس کے بیٹوں نے مقبرہ تعمیر کرایا۔ اس مقبرے کے ساتھ بہت بے اہمیاں
اور زیا دنیاں ہوئیں۔ لوگ عقیقت سے مقبرے پر جاتے تھے اور قبر سے مٹی اور
دروازوں سے کھڑکی کے کھڑے برکت کے طود پر تراش کر لے آتے تھے۔ سب سے
بڑا ظلم ایک انگریز لارڈ ایجنو نے کیا کہ مقبرے کا بڑا دروازہ اکھاڑ کر اس غلط فہمی میں
ہندوستان لے گیا کہ یہ سومات کے مندر کا دروازہ تھا جو سلطان محمود اپنے ساتھ
لے گیا تھا۔ یہ مقبرہ اب اُجڑے ہوئے ایک خاموش کھنڈر کی طرح غزنی سے
دُور کھڑا ہے۔